کے لیے مرتب کیا ہے، پہلی جلد میں زمین و زراعت کے متعلق عام معلومات، کھیتی باڑی کو مفید اور منفعت بخش بنانے کے اصولوں اور قومی حکومت کی بعض مفید زرعی و زمینی اصلاحات کا ذکر ہے، مثلاً استعمال اراضی، ایگریکلچرل سروسز، کوآپریٹو سوسائٹیوں، پودوں کی بناوٹ، نشو و نما کے عمل، زراعتی علم کیمیا، آب و ہوا، موسم، زرعی مٹی، بیج، کھاد، آبپاشی وغیرہ

دوسری جلد میں ہندوستانی اجناس اور پیداوار، غلے، مسالے، پھلوں، ترکاریوں اور چائے وغیرہ کے باغات کی کاشت اور نگرانی کے طریقے، مویشیوں کے چارے، چراگاہوں، اور پودوں کی مختلف بیماریوں اور ان کے تدارک کی صورتیں بتائی گئی ہیں۔ آخری جلد میں کھیتی باڑی، باربرداری، سواری اور خوراک میں کام آنے والے جانوروں، مچھلیوں شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، جنگلی جانوروں اور جنگلات وغیرہ کے متعلق دلچسپ معلومات ہیں، ہر باب کے آخر میں طلبہ کی سہولت کے لیے اس کا خلاصہ، مشقی سوالات اور جا بجا نقشے اور شکلیں بھی دی گئی ہیں، جس سے نظری معلومات کے ساتھ اس کی عملی شکلیں بھی سامنے آجاتی ہیں، اور ہر جلد کے آخر میں سائنٹفک ناموں، ٹیکنیکل اصطلاحات اور الفاظ کا فرہنگ بھی دے دیا ہے، اصل کتاب انگریزی میں تھی، یہ اس کا اردو ترجمہ ہے، یہ اگرچہ نصابی تعلیم کے لیے لکھی گئی ہے، لیکن کسانوں کے لیے بھی بڑی کار آمد ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۳ ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۹ء عدد ۲

مضامین

مقالات

شذرات

اس دور میں نانوتہ اور گنگوہ کی شمعِ ہدایت سہارنپور میں روشن اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، اور مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی کا روحانی فیض حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی ذات سے جاری ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان است — خم و خمخانہ با مہر و نشان است

سلسلۂ چشتیہ صابریہ راقم کا خاندانی سلسلہ ہے، اس لیے حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری کی تمنا عرصہ سے تھی، جو الحمدللہ گذشتہ مہینہ عزیز محترم مولانا علی میاں کی رفاقت و رہنمائی میں پوری ہوئی اور اکابر شیخ کے جو حالات کتابوں میں پڑھے تھے، سہارنپور میں انکا جلوہ اپنی آنکھوں سے دیکھا، حضرت شیخ نے اس ناکارہ پر بڑی توجہ فرمائی، اللہ تعالیٰ ان کی توجہ کے طفیل میں حسن عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرت شیخ کی ذات سراپا جمال ہے، نہ مشیخت کی شان، نہ اس کے آداب و رسوم کی پابندی، نہ زاہدانہ تقشف، نہ خشک وعظ و پند، مزاج میں سادگی و بے تکلفی، باتوں میں حلاوت و شگفتگی، لطف و مدارات، اور مکارم اخلاق کا مجسم پیکر جو دلوں کو تسخیر کرتا ہے، شیخ کی زندہ کرامت ان کے دسترخوان کی وسعت، اس کا تنوع اور مہمان نوازی ہے، کوئی دن تیس چالیس مہمانوں سے خالی نہیں ہوتا اور بعض زمانوں میں انکی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جاتی ہے، پھر ہر مہمان کی ضروریات کا پورا لحاظ جس کی مثال اس زمانہ میں نہیں مل سکتی، یہی حال روحانی فیوض و برکات کا ہے، اس زمانہ میں سلسلۂ چشتیہ صابریہ قدوسیہ کا فیض سب سے زیادہ حضرت شیخ ہی کی ذات سے جاری ہے، اللہ تعالیٰ اس سرچشمۂ ہدایت کو عرصۂ دراز تک جاری رکھے۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ مولانا ظفر اللہ صاحب عثمانی نے وفات پائی، مرحوم تحریک خلافت کے دور کی یادگار تھے، ایک زمانہ میں قومی و ملی تحریکوں میں انکا نمایاں حصہ رہا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے خونیں

ہنگامے میں جب پانی پت مسلمانوں سے خالی ہوگیا تھا، اسکی مسجدیں ویران اور خانقاہیں سونی ہوگئی تھیں، ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور انھوں نے اپنے جد امجد حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیا کا آستانہ نہ چھوڑا، ان کے اس استقلال سے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم دوبارہ جم گئے اور ان کی دینداری اور حسن اخلاق سے وہ شرنارتھی جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے، ان کے عقیدتمند بن گئے اور آج پانی پت میں جو مسلمان نظر آتے ہیں، وہ سب ان کے استقلال اور قوت ایمانی کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ اس مرد مجاہد کے مراتب بلند فرمائے۔

دوسرا حادثہ باغپت کے نوجوان رئیس نواب شوکت خاں کی وفات ہے، انکو اللہ تعالیٰ نے دنیاوی وجاہت کے ساتھ دینداری کی دولت سے بھی نوازا تھا، چنانچہ وہ حاجی اور حافظ بھی تھے جس کی مثال جدید تعلیم یافتہ نوجوان رئیسوں میں مشکل سے ملے گی، اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکے تھے، سنی سنٹرل وقف بورڈ کے صدر تھے، اس تعلق سے کئی سال ان سے سابقہ رہا، طبعاً نہایت شریف اور مہذب و متین تھے، عمر چالیس بیالیس سال سے زیادہ نہ تھی، اللہ تعالیٰ اس نوجوان اور دیندار رئیس کی مغفرت فرمائے۔

ہندوستان میں دین و ملت، دینی علوم، اسلامی تہذیب و ثقافت کے سب سے بڑے محافظ و نگہبان عربی مدارس ہیں، انکا جو نام و نشان بھی باقی ہے وہ سب ان ہی کا طفیل ہے، مگر یہ افسوسناک کمی ہے کہ ان میں باہم کوئی ربط و علاقہ نہیں، چند مشہور مدارس کو چھوڑ کر ان کے حالات سے بھی لوگوں کو واقفیت نہیں، اور نہ آجتک انکی تاریخ قلمبند کی گئی، کئی سال ہوئے مغربی پاکستان کے عربی مدارس کی ایک ضخیم تاریخ "جائزہ مدارس عربیہ اسلامیہ مغربی پاکستان" کے نام سے شائع ہوئی تھی جس میں ان کے متعلق ضروری معلومات درج ہیں، ہم نے اسی وقت لکھا تھا کہ ہندوستان کے عربی مدارس کی اسی قسم کی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت ہے، اب یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ سعید اختر صاحب ایڈیٹر مدینہ اخبار نے اس اہم کام کا بیڑا اٹھایا ہے، مدینہ اردو داں حلقوں میں جاتا ہے، اس لیے ان میں تو یہ آواز پہنچ جائے گی لیکن غیر اردو داں علاقوں

میں اس کے اعلان و اشتہار اور وہاں کے علماء اور عربی مدارس کے منتظمین سے خط و کتابت کی ضرورت ہے، اگر یہ تاریخ مرتب ہو جائے تو ایک بڑا مفید کام ہوگا، لیکن سعید اختر صاحب اسلامی مکاتب کو بھی اس میں شامل کرنا چاہتے ہیں، جو بڑا دشوار کام ہے، ایک صوبے کے مکاتب کا استقصاء بھی بہت مشکل ہے، اور پورے ہندوستان کا تو ناممکن ہے۔ اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں، اس لیے اس کتاب کو صرف عربی مدارس کے حالات تک محدود رکھنا چاہیے، یہ کام نسبتاً آسان بھی ہے اور ضروری بھی۔

گذشتہ مہینہ لکھا جا چکا ہے کہ پاکستان کے ناشرین نے دار المصنفین کی کتابیں چھاپ لی ہیں اب یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض ناشر سیرۃ النبیؐ کا پورا سٹ چھاپنے کا ارادہ کر رہے ہیں، پاکستان کی بدولت یوں ہی ہندوستان کے اسلامی ادارے نیم جان ہو رہے ہیں، اب اس کے خود غرض ناشر ان کو بالکل ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں، اگر دار المصنفین کی کتابیں اسی طرح پاکستان میں چھپتی رہیں تو اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اگر حکومت پاکستان تک ہماری آواز پہنچ سکتی ہے تو ہماری درخواست ہے کہ وہ ان ناشروں کو اس خود غرضی سے روکنے کی کوشش کرے، عرصہ ہوا ایک ناشر نے سیرۃ النبیؐ کا پہلا حصہ چھاپ لیا تھا، اس زمانہ میں سردار عبد الرب نشتر زندہ تھے، انھوں نے اس تاجر کو روکا اور پاکستانی پریس نے اس کے خلاف اتنا لکھا کہ وہ مطبوعہ کتابیں دار المصنفین کے حوالہ کرنے پر مجبور ہو گیا، اس میں سب سے زیادہ حصہ شورش صاحب کاشمیری کا تھا، اسلیے ہم کو امید ہے کہ پاکستانی پریس اس مرتبہ بھی دار المصنفین کے ساتھ اپنی علمی ہمدردی کا ثبوت دے گا۔

اس مہینہ میں مرزا غالبؔ پر ان کی صد سالہ یادگار کے سلسلہ میں دو مضمون نکل رہے ہیں اس لیے دوسرے مضامین کی گنجائش نہ نکل سکی اور بعض مسلسل مضامین روک دینا پڑے جو آیندہ مہینہ شائع ہوں گے۔

مقالات

غالبؔ

۱۷۹۷ء — ۱۸۶۹ء

(مدح و قدح کی روشنی میں)

از سید صباح الدین عبد الرحمن

اس سال جبکہ اسد اللہ خاں غالبؔ کی صد سالہ برسی ہندوستان میں نہایت دھوم دھام سے منائی جا رہی ہے، خیال ہوا کہ اس سو سال میں ان پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا ایک جائزہ لیا جائے، تاکہ ظاہر ہو کہ ان کی مدح سرائی کی نوعیت کیا ہے، اور اگر کسی نے ان کی تنقیص کی ہے تو اس کا کیا انداز ہے، ظاہر ہے کہ اس مضمون میں غالبیات کی ہر کتاب اور ہر تحریر کا احاطہ ممکن نہیں ہو سکتا ہے، پھر بھی ان پر جتنی اہم کتابیں اور قابلِ توجہ تحریریں شائع ہوئی ہیں، اُن کا ذکر اس میں ضرور آگیا ہے، اس مقالہ کا جو مقصد ہے اس میں کتابوں اور تحریروں کے اقتباسات اور خلاصے کا ذکر آنا ناگزیر تھا، ان کو پیش کرتے وقت طوالت سے بچنے کی خاطر اختصار سے کام لیا گیا ہے، ناظرین کی تشنگی اس سے فرو نہ ہو تو وہ اُن تصانیف اور تحریروں کی طرف رجوع کریں جن کا ذکر اس مضمون میں آیا ہے، اور اگر اس میں کوئی اہم کتاب یا مضمون نظر انداز ہو گیا ہو تو ان سے درخواست ہے کہ اسکی طرف توجہ دلائیں، تاکہ یہ مضمون کتاب کی صورت میں شائع ہو تو اسکا ذکر کر کے یہ کمی پوری کر دی جائے۔

شیفتہ اور غالب اسد اللہ خاں غالب اُن خوش قسمت اربابِ کمال میں ہیں جن کو ان کے کمالات کی داد ان کی زندگی ہی میں ان کے ممتاز معاصروں سے بھی ملی، ان کا دور اس لحاظ سے بڑا ممتاز رہا کہ بڑے بڑے اصحابِ فن وارباب فضل کا اجتماع ہوگیا تھا۔ اُن ہی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، سرسید احمد خاں، مولوی امام بخش صہبائی، نواب ضیاء الدین نیر، مفتی صدر الدین آزردہ، اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ تھے، شاعروں میں محمد ابراہیم ذوق، مومن خاں، غلام غوث بیخبر، غلام علی وحشت، میر حسین تسکین وغیرہ تھے، یہ سب ہی غالب کے فن کے معترف تھے، لیکن ان میں بہت بڑے قدرداں شیفتہ، سرسید احمد خاں، اور امام بخش صہبائی تھے۔

شیفتہ شاعری کے اعلیٰ مذاق کے لیے اپنے معاصرین میں بہت قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کو اپنی شاعری پر ناز تھا، خود کہتے ہیں:

ہے کارنامہ جب سے بیاض اپنی شیفتہ	تقویم سال رفتہ ہے دیوان کلیم کا
دیواں کو ہمارے بتوں کی نگاہ میں	اے شیفتہ وہ رتبہ ہے جو پید وژند کا
یہ انداز دلکش کہاں شیفتہ	جگر کاوی مرغ بستاں عبث
یہ طرز ترنم کہیں زنہار نہ ڈھونڈو	اے شیفتہ! مرغ چمن رکھتے ہیں باہم
دلی میں تو شیفتہ ہے استاد	ہم قصد سوئے عجم کریں گے

خود غالب بھی ان کی سخن فہمی کے ذوق کی پاکیزگی اور بلندی کے قائل تھے، ان ہی کی پسند و ناپسند کو شعر کے حسن و قبح کا معیار قرار دیتے تھے، کہتے ہیں:

غالب بفن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او	ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

شیفتہ نے ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء میں اردو شعرا کا ایک تذکرہ گلشن بے خار کے نام سے فارسی میں لکھا جس میں وہ غالب کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ غیرت افزائے صفاہان و شیراز، طوطی بلند پرواز، چمن معانی،

بلبل نغمہ پرداز گلشن شیوا بیانی ہیں، ان کے خیال کی بلندی کے آگے اوجِ فلک پستی زمین ہے ان کے فکر کا شاہین عنقا کے شکار کے سوا کسی اور کا نہیں کرتا ہے، اور ان کا شہبِ طبع عرصۂ فلک کے سوا اور کہیں نہیں دوڑتا ہے" وغیرہ وغیرہ، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں وہ پہلے مرزا عبد القادر بیدل کے طرز میں کہتے تھے، مگر پھر اس سے اعراض کرنے لگے اور ایک مطبوع انداز کا ابداع کیا، اپنے پہلے دیوان سے بہت سے اشعار کو حذف اور ساقط کردیا، اور اس کا انتخاب کیا، فارسی زبان میں بھی اشعار کہتے ہیں، اور ان کا انداز اس زبان کے استادوں سے کم نہیں، ان کی غزل نظیری کی غزل کی طرح ہے، ان کا قصیدہ عرفی کے قصیدہ کی طرح دلپذیر ہے، وہ شعر کے نکات ولطائف کو بھی خوب سمجھتے ہیں، جس کے بعد شیفتہ کہتے ہیں کہ سخن سنجی اور سخن فہمی جیسی دونوں فضیلتیں کم لوگوں میں جمع ہوتی ہیں، جو غالب میں موجود تھیں، آخر میں غالب کے ۴۸ اشعار کے نمونے دیے ہیں، غالب کا سنہ پیدائش ۱۷۹۷ء ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ جب شیفتہ نے ۱۸۳۴ء میں اپنا تذکرہ لکھا تو غالب نے ۳۷، ۳۸ سال کی عمر میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی، اور ان کی شاعری اور نثر نگاری کا سکہ جم چکا تھا،

شیفتہ اپنے مکتوبات میں بھی ان کی نظم اور نثر دونوں کی تعریف کرتے رہے، مرزا کا ایک خط ان کے پاس پہنچا تو اس کے جواب میں پہلے تو یہ شعر لکھا

اے زنقش خامہ مشکیں رقم تو	نسریں کدہ درجیب دبغل باد صبا را

پھر ان کی نثر کو نثرہ نثار اور ان کے اشعار کو شعریٰ اشعار کہکر لکھا کہ ان کی وجہ سے ان کا سینہ ایمن نور اور دل سحر فروغ سدا آگیں ہوگیا اسی مکتوب میں ان کی ایک نظم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسی زمین میں عرفی اور طالب کی بھی نظمیں ہیں، عرفی کی سیرابی معنی مسلم ہے، اور طالب آملی میں شادابی الفاظ ہے، لیکن ان کی یعنی غالب کی نظم میں جو نغز گوئی اور نادرہ سنجی ہے، وہ خاص ان ہی کا حصہ ہے"

(بحوالہ فارسی مکتوب منقولہ ادبی خطوط غالب از مرزا محمد عسکری، ص ۲۵۳)

مولوی کریم الدین اور غالب مولوی کریم الدین بھی غالب کے معاصر تھے، وہ آگرہ کالج میں اردو کے مدرس تھے، انھوں نے مختلف موضوع پر کئی کتابیں لکھیں، شاعر تو نہ تھے لیکن شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے، شعراء کے کئی تذکرے لکھے، ان ہی میں ایک طبقات الشعرائے ہند ہے، جو غالباً ۱۸۴۷ء میں مرتب ہوا، اس کا خلاصہ سید عطاء الرحمن عطا کاکوی صاحب نے ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے، اس میں مولوی کریم الدین لکھتے ہیں: اسد اللہ خاں مشہور مرزا نوشہ خاندان فخیم اور رؤسائے قدیم سے ہیں......

مہارت کتب فارسی کی ان کو بہت ہے، اکثر آدمی شاہجہان آباد میں ان کے شاگرد ہیں، فارسی شعر بھی انکا بہت اچھا ہے، ایک دیوان فارسی زبان کا ان کی تصنیف ہے، منشی نور الدین صاحب کے اہتمام سے مطبع صادق الاخبار میں چھپا ہے، بہت بڑا دیوان ہے، یہ دیوان ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں چھپکر تیار ہوا ہے، اور ایک دیوان اردو ان کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے، وہ بھی مطبع سید الاخبار میں (غالباً) ۱۸۴۱ء کے چھپا تھا، حال اس دیوان کا یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک دیوان بہت بڑا کئی ہزار شعر کا فراہم کیا تھا، اس کو منتخب کرکے چھوٹا سا دیوان دو تین جز کا بنا لیا، وہ دیوان بندہ کے پاس بھی ہے، میں نے جو ثقہ لوگوں کی زبانی سنا تھا نقل کر دیا، دروغ برگردن راوی لیکن اس مقولہ کا موید قول صاحب تذکرۂ گلشنِ بے خار کا بھی ہے، اس کے بعد وہ غالب کے ۱۳ شعر درج کرتے ہیں۔ (طبقات شعرائے ہند، طبقہ چہارم، ص ۱۵ - ۱۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی کریم الدین اور غالب کے براہ راست تعلقات نہ تھے، اسی لیے ان کی اردو شاعری پر اپنے خیالات کے اظہار کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی ہے۔

سرسید احمد خاں اور غالب سرسید احمد خاں شیفتہ سے زیادہ غالب کے قدردان اور معترف تھے، انھوں نے تقریباً ۱۸۴۵ء میں آثار الصنادید لکھی، جبکہ غالب کی عمر ۴۸ سال کی تھی، اس میں غالب کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر غالب کی مدح سرائی کی ابتدا تھی تو اس کو انتہا بھی سمجھنا چاہیے، کیونکہ جو تعریف سرسید نے

کردی ہے، اس سے بڑھ کر اس سو سال کے اندر کسی اور سے نہیں ہوسکی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ سرسید کو غالب سے کیسی شیفتگی اور وارفتگی تھی، ان کو "ہمائے اوج مفاخر و معالی جاگزین"، "سدرۃ المنتہیٰ مراتب بلند و مدارج عالی"، "موسس اساسِ شیوا بیانی"، "بانی بنائے الفاظ و معانی"، "عندلیب بہارستانِ سخن گستری"، "طوطی شکرستانِ معنی پروری"، "اوج سمائے برتری و والاتباری"، "مہر سپہر بلند اختری"، "گردون اقتداری"، "شاگرد رحمٰن"، "استاد سحبان العجم زمان لوذعی" وغیرہ کہا ہے، اسی پر وہ اکتفا نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ دیوان حافظ ان کی لسان الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش، زبان خلاق المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانہ میں خاموش، چراغ انوری ان ہی کے شعلۂ فکر سے روشن اور سینۂ آذری ان ہی کی آتش حسرت (؟) سے گلخن عنصری ان کے رشکِ افکار سے ایسا جل گیا کہ اس کا پیکر فقط آتش سے متکون ہوا تھا، اور سحبان ان کی حسرت کمال سے ایسا رویا کہ گویا اس کی بینائی چشم فقط عنصر آب سے بنی تھی، زلالی ان کے چشمۂ ہنر کا تشنہ لب اور ابو اسحاق ان کے خوان اطعمۂ استعداد سے نعمت طلب، خاقانی اس خسرو معنی کی کمتر رعیت اور خسرو اس بادشاہ سخن کے آگے سرگرم خدمت، ملاحت کلام ان کے خوان فیض کی نمک خوار اور شیرینی زبان حافظ اُن کی نعمتِ مقال سے روزینہ دار ہے۔ اس مدحت طرازی کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رنگینی معنی سے صفحہ کو گلزار رنگ اور طراحی نکتہ سے کاغذ کو ارژنگ کرنا خاصہ اسی چمن طراز سخنوری اور نقاشی صحیفہ ہنرپروری کا ہے، اگر الفاظ ثقیل سے گرانی اٹھائے تو کوہ کاہ کا حکم پیدا کرے اور اگر سخن میں متانت صرف کرے تو ورق بیاض صدمۂ صرصر سے جگہ سے نہ ہٹے، قلم ان کا معنی روشن کی تراوش سے فوارۂ نور اور عبارت پاکیزہ ان کی لطف کیفیت سے شراب انگور۔"

اس کے بعد سرسید غالب کے مختصر حالات لکھتے ہیں، جس میں ان کے تیس جز کے ایک مطبوعہ

دیوان پنج آہنگ اور غزوات پر پندرہ سولہ جز کی ایک ناتمام مثنوی کا ذکر کرتے ہیں پھر ان کی فارسی نثر، مثنوی، رباعی، عبارت در صنعت مقطع الحروف، غزلیات کے نمونے دیے ہیں، آخر میں ریختہ کے بیس اشعار ہیں جو سرسید کو پسند آئے تھے۔

سرسید احمد خاں نے اوپر کی تحریر اس وقت لکھی جب مقفی، مسجع اور مرصع عبارت کے لکھنے اور مبالغہ آرائی کرنے کا عام رنگ تھا، اگر وہ اپنے تہذیب الاخلاق کے دور میں غالب پر کچھ لکھتے تو اس میں ان کی تحریر اور مبالغہ آرائی کا یہ طرز نہ ہوتا، آثار الصنادید غالب کی زندگی ہی میں لکھی گئی جو ان کی نظر سے گذری تھی، سرسید احمد خاں کی یہ مدحت طرازی ان کو گراں نہ گزری ہوگی، کیونکہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی تعریف اسی انداز میں کی تھی، ان کی شاعری کو عارفانہ کلام کہا، قیصر روم کو ان کا جان نثار بتایا، مولانا جامی جیسے لوگوں کو ان کے تصوف کی شراب کا جرعہ خوار قرار دیا، ان کو ایرج، تور اور بہرام جیسے بادشاہوں کا وارث قرار دیا، اور ان کے بازو کے بارہ میں لکھا کہ گیو، گودرز، بیژن اور رہام جیسے پیل تن پہلوان اس کی قوت کو جانتے ہیں۔

چشم بد دور خسروانہ شکوہ　　　لوحش اللہ عارفانہ کلام

جان نثاروں میں تیرے قیصر روم　　　جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے　　　ایرج و تور و خسرو و بہرام

زور بازو میں مانتے ہیں تجھے　　　گیو و گودرز و بیژن و رہام

لیکن سرسید نے غالب کی جو مدح کی ہے اس سے موجودہ دور میں غالب کا سب سے بڑا پرستار بھی شاید اتفاق نہ کرے گا اور وہ غالب کو انوری، عنصری، خاقانی، سعدی، حافظ اور خسرو وغیرہ جیسے تمام اساتذہ سے برتر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ سرسید کی اس

بارے کا حوالہ موجودہ دور کے مصنفوں اور مقالہ نگاروں کی تحریروں میں دیکھنے میں نہیں آیا۔

صہبائی اور غالب

امام بخش صہبائی بھی غالب کے معاصروں میں تھے، فارسی میں اپنی قابلیت ولیاقت کے لیے مشہور اور مقفی و مسجع عبارت کے دلدادہ تھے، سرسید احمد خاں کو آثار الصنادید لکھنے میں بڑی مدد دی، اسی لیے ان کی گلستان سخن (مولفہ تقریباً ۱۸۵۴ء) میں غالب کے متعلق ویسی ہی عبارت آرائی ہے جو آثار الصنادید میں ہے، وہ مرزا غالب کو "شیر نیستان سخنوری"، "شیر بیشۂ معنی پروری"، "یکہ تاز عرصۂ کمال"، "یگانہ نشور افضال"، "سیاح زمین سخن"، "دانائے نادر فن"، "زبدہ کملائے جہاں" کہتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ وہ سخن سنج بے مثل ونظیر اور صاحب طرز دلپذیر ہیں، انھوں نے اپنے خامۂ گوہر بار سے اقلیم سخن میں لوائے جہانگیری بلند کیا ہے اور یوسف معنی کو اس ہجوم بے تمیزی میں زلیخا منشان مصر سخن کی نظر میں ارجمند کیا ہے، فضائل اگر اس قدوۂ افاضل کی ذات پر تکیہ نہ کرتے فضیلت نہ رکھتے اور کمالات اگر اس زبدۂ کملا سے مدد نہ لیتے عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے، سیاہی رقوم اس کی رنگینی معنی سے ہم شکل طاؤس صفحۂ قرطاس اس کے فروغ مضامین ہمرنگ فانوس، برق طور اگر اس کی تجلی معنی کے مقابل ہوجاتی سرمہ ہوجاتی، شمع ایمن اگر اس کے شعلۂ فکر کے سامنے آتی، فروغ نہ پاتی۔ الخ الخ

(گلستان سخن ص ۳، ۴)

اس قسم کی مدح سرائی سے موجودہ دور کے نقاد شاید کوئی استفادہ کرنا پسند نہ کریں گے لیکن اس سے کم ازکم یہ اندازہ ضرور ہوگا کہ غالب اپنے معاصروں کی نظر میں کس قدر بلند تھے،

غلام غوث بیخبر اور غالب

خان بہادر، ذوالقدر غلام غوث بیخبر بھی غالب کے معاصروں اور دوستوں میں تھے، وہ اپنے زمانہ کے گورنر جنرل کے میر منشی ۴۴ سال تک رہے، اچھے قسم کا ادبی ذوق بھی رکھتے تھے، غالب نے ان کی ایک غرض کے ابداع اور جدت طرز کی تعریف

کی ہے (اردوئے معلی ص ۴۴۳)۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سلیس اور عام فہم اردو میں مکتوب نگاری ۱۸۴۶ء ہی سے شروع کردی تھی، کیونکہ مرزا غالب کا کوئی خط ۱۸۵۰ء سے پہلے کا نہیں ہے۔ ان کو غالب سے بڑی محبت تھی، عود ہندی کی ترتیب میں ان کی مدد بھی شامل رہی، وہ غالب کی شاعری اور خصوصاً ان کے خطوط کی نثر نگاری کے بڑے قدردان رہے، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:-

حضرت! خدا گواہ اور محبت شاہد ہے کہ ہمیشہ آپ کے خطوں کے لیے اپنا جی تڑپا کیا، اکثر آپ کو یہ لکھنا چاہا کہ جب تک میں زندہ ہوں مجھ سے تو سلسلۂ تحریر قطع نہ کیجئے، اس محبت کو تا دم آخر نباہ دیجئے، لیکن آپ کے ضعف کا حال جو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور پھر بعضوں سے یہ سنا کہ اب آپ نے اپنے خدام سے فرما دیا ہے کہ کوئی کا خط ہو تو مجھے دکھایا ہی نہ کرو، اس سبب سے تحریر پر جرأت نہ کرسکا، دل پر جبر کرکے بیٹھ رہا، اب جو آپ کا عنایت نامہ آیا، نہیں کہہ سکتا کہ کیسی خوشی ہوئی، ان چند سطروں کو بار بار پڑھا گیا، دیر تک ایک کیفیت قلب پر طاری رہی، جو بیان میں نہیں آسکتی، قسموں کی کیا حاجت ہے، اگر اتنا بھی معلوم ہو کہ میرے دس خط کا ایک جواب آئے گا تو حضرت کے دیوان خانہ کا طاقچہ میرے خطوں سے بھر جائے گا۔" (فغان بےخبر، مطبوعہ الہ آباد، ص ۱۲۸)

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:-

"کل میں ایٹہ میں تھا، مرزا حاتم علی مہر جو اپنے بیٹے کے اس ضلع میں سررشتہ کلکٹری ہونے کے سبب سے بالفعل وہیں ہیں، میرے پاس بیٹھے تھے کہ ہرکارہ ڈاک کا آپ کا خط لایا، میں نے پڑھا، انھوں نے سنا، دونوں نے لطف اٹھایا، پہلا مجموعہ اگر ایسا مہمل چھپا تو دوسرے کا چھپنا بہت مناسب ہوا، مگر گستاخی معاف، یہ نام اردوئے معلی نہایت

پھوہڑ رکھا گیا ہے، لالہ صاحب یا بابو صاحب کی تجویز ہوگی، آپ نے اخلاق سے دخل نہ دیا ہوگا، آپ کی تصنیف اور ایسا بھدا نام! لاحول ولا، اے قبلہ قند ہندی نام رکھا ہوتا، پھر سے جو چھپا ہے قند مکرر، فرمایا ہوتا، یہ دونوں نام کیسے شیریں تھے، جب چھاپہ اہتمام پر آئے اور قیمت قرار پائے تو مجھے اطلاع ہو، کچھ جلدیں میں بھی لوں گا۔" (فغان بےخبر، ص ۱۳۰ - ۱۲۹)

ذوق اور غالب

غالب اور ذوق کی چشمک مشہور رہے، اور جتنی تھی اس سے زیادہ بعد کے اہل قلم نے ہوا دیدی ہے، اور دونوں کے حریفانہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں، لیکن محمد حسین آزاد کی روایت ہے کہ ایک دن استاد مرحوم سے مرزا صاحب کے انداز نازک خیال اور فارسی ترکیبوں اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا، میں نے کہا بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے، تو قیامت ہی کر جاتا ہے، فرمایا خوب! پھر کہا جو مرزا کا شعر ہوتا ہے، اس کی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی، شعر ان کے میں تمھیں سناتا ہوں، کئی متفرق شعر پڑھے تھے، ایک اب تک خیال میں ہے،

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

(آب حیات ص ۴۸۰)

غالب کے ناقد معاصرین

غالب کے معاصروں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی مشکل گوئی کو پسند نہ کرتے تھے، گو ایسے لوگوں کا درجہ اس زمانہ کے شعر و ادب میں اونچا نہ تھا، پھر بھی وہ ان کو چھیڑا کرتے تھے، محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ ایک دفعہ مرزا کسی مشاعرہ میں موجود تھے تو اس وقت مشاعرہ میں ایک شگفتہ طبع اور شگفتہ مزاج شاعر حکیم آغا جان عیش بھی وہاں تھے، انھوں نے اپنی طرحی غزل میں غالب کو مخاطب کرکے یہ قطعہ پڑھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے ایک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اس زمانہ کے ایک مہمل گو شاعر اوج تھے، انھوں نے بھی غالب پر یہ شعر کہکر چھینٹے والے

ڈیڑھ جزپر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب — غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا

(آب حیات، ص ۴۸۰ - ۴۸۱)

حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ میر تقی میر نے جو مرزا کے ہموطن تھے، ان کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈالدیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا، ورنہ مہمل بکنے لگے گا...... مرزا کے حق میں یہ جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی، اس کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں، ظاہر ہے، مرزا اول ایسے رستے پر پڑ گئے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چیں ہم عصروں کی خوردہ گیری اور طعن و تعریض سدراہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے، تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے، جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پرشوکت و شاندار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنے ندارد، مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے، ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف الطبع تھے، اور جن کو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا تھا، مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا، اور اسی وقت دو مصرعے موزوں کرکے مرزا کے سامنے پڑھے

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال — پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا یہ سنکر حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں، مولوی عبدالقادر نے ازراہ مزاح کے کہا میں نے خود آپ کے دیوان میں دیکھا ہے، اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں،

آخر مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں، اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمہارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں، مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اردو اور فارسی دیوان میں جابجا اشارہ کیا ہے۔ (یادگار غالب، ص ۱۰۹ - ۱۰۸)

آزاد اور حالی دونوں نے لکھا ہے کہ اس قسم کی تعریضوں سے مرزا غالب کو فائدہ ہوا، آزاد نے معترضوں کے حملے کا ذکر کرکے لکھا ہے، اسی واسطے اواخر عمر میں نازک خیالی کے طریقہ کو بالکل ترک کر دیا تھا، چنانچہ دیکھو اخیر کی غزلیں صاف صاف ہیں (آب حیات ص ۴۸۱)

حالی کا بھی بیان ہے کہ چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی، اسلئے نکتہ چینیوں کی تعریضوں سے ان کو بہت تنبہ ہوتا تھا، آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی،

(یادگار غالب، ص ۱۰۹)

غالب اور محمد حسین آزاد غالب کے حالات زندگی اور ان کے شعری اور نثری کارناموں کا باضابطہ ذکر پہلی دفعہ مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات میں آیا ہے، جو ۱۸۸۳ء میں یعنی غالب کی وفات کے چودہ[۱۴] سال بعد شائع ہوئی، محمد حسین آزاد ذوق کے شاگرد تھے، اس لیے ان پر یہ الزام ہے کہ آب حیات میں انھوں نے ذوق کو جو درجہ دیا ہے، وہ غالب کو دینا پسند نہیں کیا ہے، اسی لیے غالب کا ذکر ذوق کے بعد کیا ہے، اور ذوق کے متعلق یہ لکھ کر کہ "ان پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا، چنانچہ اب ہرگز یہ امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو" غالب کا رتبہ کم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کا ردعمل اچھا نہیں ہوا، کیونکہ آب حیات کی اشاعت کے بعد ہی غالب کے مداحوں اور پرستاروں کی جماعت بڑھتی گئی اور ان کے مقابلہ میں ذوق کی شہرت ماند پڑتی گئی، یہانتک کہ ذوق کے بعض بے درد نقادوں نے لکھ دیا ہے کہ "ذوق کی شاعری کیا ہے ایک متعفن لاشوں کا مقبرہ ہے۔" ذوق کے یہاں بھی غالب کی طرح مشکل پسندی ہے

لیکن غالب کی مشکل پسندی نہ صرف علمیت کے اظہار کے لیے ہے بلکہ ابتذال سے بھی بچنے کے لیے ہے لیکن ذوق کی مشکل پسندی محض اس لیے تھی کہ ان کو غالب کے ساتھ شوق مسابقت تھا"، ذوق کی شاعری کے اس قسم کے ناقدانہ مطالعہ میں اعتدال کا وہی فقدان ہے جو محمد حسین آزاد کی اس تعریف و تحسین میں نظر آتا ہے، جو انھوں نے اپنے استاد کی محبت و عقیدت میں یہ لکھ کر کی ہے کہ "جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ سخن کے پھولوں کا تاج سجایا جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو تراوت بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر گرا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے"

آب حیات ص ۴۰۶ - ۴۰۵)

آزاد نے اپنے استاد کی جو مدح سرائی کی ہے اس سے غالب کے پرستار خواہ کتنے ہی آزردہ ہوں لیکن اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ غالب کی شخصیت اور ان کی شاعری کے روشن پہلوؤں کو باضابطہ تحریر میں لانے کی اولیت آزاد ہی کو حاصل ہے، انھوں نے غالب کے حالات تو بہت مختصر لکھے ہیں، ظاہر ہے کہ ایک عام تذکرہ میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہ تھی لیکن آزاد ہی نے پہلی دفعہ غالب کی یہ تصویر کھینچی کہ اپنے لباس اور وضع قطع میں اپنا انداز سب سے الگ رکھنا چاہتے تھے (ص ۴۷۲) وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت رکھتے تھے خصوصاً خاندان کے اعزازوں کو ہمیشہ جانکاہ عرق ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے (ص ۴۷۳) ان کے کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ان کو تنگ رکھا، مگر اس تنگ دستی میں بھی امارت کے تمغے قائم تھے (ص ۴۷۴) وہ کثیر الاحباب تھے، دوستوں سے دوستی کو ایسا نباہتے تھے کہ اپنایت سے زیادہ، ان کی دوست پرستی، خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت دائرہ شرفا اور رئیس زادوں کا ان کے گرد رکھتی تھی، ان ہی سے غم غلط ہوتا تھا اور اسی میں ان کی زندگی تھی، لطیفے سے کر

دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کرتے تھے جو دوستوں سے، ادھر ہونہار نوجوانوں کا مودب بیٹھنا، ادھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا، ادھر سے سعادت مندوں کا جب مسکرانا اور بولنا تو حد ادب سے قدم نہ بڑھانا، ادھر پھر شوخی طبع سے باز نہ آنا، ایک عجیب کیفیت رکھتا، بہرحال ان ہی لطافتوں اور ظرافتوں میں زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا اور ناگوار کو گوارا کرتے، ہنستے کھیلتے چلے گئے" (ص ۴۸۴)۔ زمانہ کی بے وفائی نے ان کو وہ فارغ البالی نصیب نہ کی جو ان کے خاندان اور کمال کے لیے شایاں تھی، اور ان ہی دونوں باتوں کا ان کو بہت خیال تھا لیکن اس کے لیے وہ اپنے جی کو جلا کر دل تنگ بھی نہ ہوتے تھے، بلکہ ہنسی میں اڑا دیتے تھے۔ (ص ۴۷۶)

آزاد نے اس سلسلہ میں غالب کے اتنے لطائف و ظرائف جمع کر دیے ہیں کہ ان سے نہ صرف ان کی شوخی، بذلہ سنجی اور ظرافت طبع کا صحیح اندازہ ہوا، بلکہ وہ شعر و ادب کے اجزا بھی بن گئے، اور یہی ہر جگہ اب تک نقل ہوتے رہتے ہیں، شاید آزاد ہی نے پہلی دفعہ غالب کے لطائف و ظرائف سے لطف لینے کی توجہ دلائی۔

آزاد نے ذوق کی شاعری کی تعریف میں جو فراخدلی دکھائی ہے، اس کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو غالب کی شاعری سے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے زیادہ موجودہ دور کے اعتدال پسند نقاد لکھنا پسند نہ کریں گے، مثلاً وہ لکھتے ہیں، جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجہ عالم معنے میں کلام بلند ہے، بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجہ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے، جب ان شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے تو اس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیم سخن کا بھی بادشاہ تھا، اپنی غزل کے شعر سے سب کو جواب دیا۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ۔۔۔ نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آگے چل کر آزاد لکھتے ہیں کہ "اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین ومعانی کے بیشہ کے شیر تھے"۔ پھر رقمطراز ہیں کہ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی، اور اس سے انھیں طبعی تعلق تھا، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دی جاتی تھی کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے"۔ (ص ۴۸۰)

آزاد ہی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں مولوی فضل حق فاضل بے عدیل تھے، اور مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال شہر نظم ونثر فارسی اچھی لکھتے تھے، یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے، انھوں نے مرزا صاحب کو سمجھایا کہ ان کے دیوان میں جو بہت بڑا تھا، کچھ ایسے اشعار ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے، مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہو سکتا ہے، دونوں نے کہا خیر ہوا سو ہوا، انتخاب کرو، اور مشکل شعر نکال ڈالو، مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا، دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا، اس منتخب دیوان کے بارہ میں آزاد لکھتے ہیں کہ "وہ یہی دیوان ہے جو ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"۔ اس کی تصدیق یادگار غالب سے بھی ہوتی ہے، مگر غالب کے کسی مکتوب سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ ان کے دیوان کا انتخاب مولوی فضل حق اور مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال نے کیا لیکن وہ اپنے ایک مکتوب میں یہ لکھتے ہیں کہ "ابتدائے سخن میں بیدل، اسیر اور شوکت کے طرز پر لکھتا تھا، پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا، دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا، آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونہ کے دیوان حال میں رہنے دیے" (عود ہندی ص ۱۵۲)

اس منتخب دیوان کے دیباچہ میں غالب نے لکھا ہے کہ "اس کے علاوہ جو منتشر اور پراگندہ کلام دستیاب ہو اسے مجھ سے منسوب نہ کیا جائے"۔ لیکن موجودہ دور میں غالب کے بعض پرستار ایسے بھی ہیں جو ان کے پراگندہ اور منتشر اشعار کو ان کی طرف منسوب کرنے ہی میں ان کی عظمت کا راز سمجھتے ہیں۔

آزاد غالب کی نثر نگاری کے بھی بڑے مداح تھے، ان کے مجموعۂ مکاتیب اردوئے معلیٰ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں، مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کے خوشنما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں، بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو ہو جائیں، یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے،..... ان خطوط کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں، یہ انھیں کا ایجاد تھا کہ آپ مزے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے، دوسرے کا کام نہیں، اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں، اس کتاب میں چونکہ اصلی خط لکھے ہیں اس لیے وہ ان کی ظاہر باطن حالت کا آئینہ ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے غم والم ہمیشہ انھیں ستاتے تھے، اور وہ علو حوصلہ سے ہنسی ہی میں اڑاتے تھے، پورا لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے کہ خود ان کے حال سے اور مکتوب الیہوں کی چال ڈھال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو، غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں، اس لیے اگر ناواقف اور بے خبر لوگوں کو اس میں مزہ نہ آئے تو کچھ تعجب نہیں"۔ (ص ۴۸۳-۴۸۲)

اختصار کے ساتھ غالب کی مکتوب نگاری کی خوبیاں اس سے بہتر طریقہ پر ادا نہیں

ہوسکتی ہیں، آزاد نے غالب کو اقلیم سخن کا بادشاہ اور مضامین و معانی کے بیشہ کا شیر کہکر انکی شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے، اور پھر ان کی نثر نگاری پر جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھکر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے غالب کے کمالات دکھانے میں بخل سے کام لیا ہے، یہ اور بات ہے کہ انھوں نے حق شاگردی ادا کرنے میں ذوق کی شاعری پر جو گل فشانیاں کی ہیں ان کی جھلک غالب کے ذکر میں نہیں ہے، لیکن آزاد نے جس مشرقی تہذیب کے گہوارہ میں تربیت پائی تھی، اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اپنے استاد کو دوسرے تمام شعراء پر ترجیح دیتے۔

حالی اور غالب

آزاد ہی کی طرح حالی کو بھی اپنے استاد غالب سے غیر معمولی محبت اور شیفتگی رہی جیسا کہ ان کے مرثیۂ غالب اور ان کی تصنیف یادگار غالب سے ظاہر ہوتا ہے، مرثیہ تو اپنے استاد کی وفات کے بعد فوراً لکھا، جس میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل و جگر کے ٹکڑے اپنے قلم کی سیاہی سے کاغذ پر نکال کر رکھ رہے ہیں، یہ اپنے سوز، گداز اور غمناکی میں ایسا مقبول اور مشہور ہوا کہ اس کے لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہوگئے لیکن اس کے بعض اشعار مشاہیر کی وفات پر آج بھی نقل کیے جاتے ہیں، اس میں غالب کی ذات کی تعریف بھی ہے، ان کے شاعرانہ کمالات کی توصیف بھی اور حالی کے اپنے تاثرات بھی، اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کہیں کہیں اتنا جوش عقیدت آگیا ہے کہ بعض باتیں محل نظر ہوگئی ہیں، مثلاً وہ غالب کو پاک ذات، پاک دل اور پاک صفات کہتے ہیں، ان کے پاک دل ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، غالب کا ایک مصرع ہے

ہے دلِ پوشیدہ اور کافر کھلا

پاک دل ہونے کی وجہ سے تو "دلِ پوشیدہ" رہے، لیکن "کافر کھلا" سے ظاہر ہے کہ ان کی تمام صفات پاک نہیں، جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، اسی مرثیہ میں ان کو رند اور مست خراب بھی

کہا گیا ہے جس سے ان کے پاک صفات ہونے کی تردید ہو جاتی ہے، اسی طرح اس مرثیہ میں ہے کہ "بے صلہ مدح و شعر بے تحسین" یہ کہنا بھی صحیح نہیں، انگریزوں اور والیانِ ریاست وغیرہ کی شان میں قصیدے کہکر خلعت اور وظائف پاتے رہے، وہ اپنے خاص انداز میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں "گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا خلعت پاتا تھا خلعت موقوف بھٹئی متروک"۔ لیکن حالی کے شاعرانہ انداز بیان اور مذکورہ بالا دو باتوں کو نظرانداز کر دیا جائے تو پھر غالب کی زندگی اور ان کے کمالات کی جو مصوری اس مرثیہ میں کی گئی ہے، وہ ان کی صحیح تصویر بھی ہے اور حالی کی شاعری کے غمناک لیکن دلکش طرز ادا کی اعلیٰ مثال بھی، وہ غالب کو بلبل ہند نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس، بذلہ سنج، شوخ مزاج، مرجع کرام و ثقات، نازش خلق کا محل، فخر روزگار، کہنے کے بعد ان کو خاکسار، بے ریا، فیاض، مظہر شانِ حسن فطرت، معنی لفظ آدمیت وغیرہ سب کچھ کہتے ہیں، اس کے جستہ جستہ اشعار یہ ہیں:

بلبلِ ہند مرگیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں، نکتہ سنج نکتہ شناس — پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج — رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بے شل — دن کو کہتا تھا دن اور رات کو رات

- - - - - - - -

نازشِ خلق کا محل نہ رہا — رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانہ میں ایک رنگیں طبع — رخصتِ موسمِ بہار ہے آج

بار احباب جو اٹھاتا تھا — دوشِ احباب پر سوار ہے آج

شاعری کا کیا حق اس نے ادا — پر کوئی اس کا حق گذار نہ تھا

بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں — سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا

نذر سائل تھی جان تک لیکن — در خور ہمتِ اقتدار نہ تھا

ملک و دولت سے بہرور نہ ہوا — جان دینے پہ اختیار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی — سربلندوں سے انکسار نہ تھا

لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ — دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا

بے ریائی تھی زہد کے بدلے — زہد اس کا اگر شعار نہ تھا

ایسے پیدا کہاں ہیں مست خراب — ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا

معنی لفظ آدمیت تھا

اسی طرح اُن کے فن پر مدح و تحسین کے پھول برساتے ہیں، ان کی نثر، نظم، قصیدے اور مرثیہ کی تعریف کر کے ان کو رشک عرفی، فخر طالب، نقد معنے کا گنج داں، خوان مضمون کا میزبان، گل و بلبل کا ترجمان، رشک شیراز و اصفہان، مایہ دار سخن وغیرہ کہتے ہیں،

رشک عرفی و فخر طالب مرد — اسد اللہ خاں غالب مرد

نثر حسن و جمال کی صورت — نظم غنج و دلال کی صورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر — تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئینہ جس میں — نظر آتی تھی حال کی صورت

اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی — شکل امکان محال کی صورت

اس کی تاویل سے بدلتی تھی — رنگ ہجران وصال کی صورت

لطف آغاز سے دکھاتا تھا — سخن اس کا مآل کی صورت

- - - - - - - - - - -

نقد معنے کا گنج داں نہ رہا — خوان مضموں کا میزباں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں — گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہل ہند اب کریں گے کس پہ ناز — رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

اٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن

کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن

غالب کی وفات پر حالی کو اتنا دکھ اور غم ہوا تھا کہ وہ گوشۂ فقر اور بزم سلطانی کو محض طلسم خواب و خیال اور تاج فغفور اور تخت خاقانی کو سراسر فریب وہم و گمان، جام جمشید وراح ریحانی کو موج سراب، نطق اعرابی کو مہمل، عقل رومانی کو حرف باطل، لحن داؤدی کو ایک دھوکہ اور حسن کنعانی کو محض ایک تماشا سمجھنے لگے تھے، اسی دکھ اور غم کی شدت میں اپنے استاد کو یاد کر کے کتنے درد بھرے لہجہ میں کہا ہے:-

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی تھی — یہاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

شہر میں ایک چراغ تھا نہ رہا

اور اپنے غمناک جذبات سے مغلوب ہو کر استاد کی محبت میں کہتے ہیں:-

لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ کو — سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسیؔ و صائبؔ و اسیرؔ و کلیم — لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کے کلام کو دیکھا — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

آگے چل کر لکھتے ہیں :-

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے — انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے — علم و فضل و کمال کی صورت

اس مدح میں وہی رنگ آگیا ہے جو آزاد کی تحریروں میں اپنے استاد ذوق کی تعریف میں ملتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں :-

ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا، اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا، چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو، سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہوگیا، نہ ہم صفیر رہے نہ ہم داستاں رہے ...... مرزا سودا کے بعد قصیدہ نگاری میں شیخ کے سوا کسی نے قلم نہیں اٹھایا، اور انھوں نے مرتبے کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا، انوری، ظہیر ظہوری، نظیری، عرفی فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں لیکن ان کے (یعنی استاد ذوق کے) قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہندوستان کی زمین کو آسمان کر دکھایا ......

خیال بندی ہو یا عاشقانہ یا تصوف، ان کے سینہ میں جو دل تھا گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا، ہزاروں آدمیوں کے دل تھے، اس واسطے کلام ان کا مقناطیس کی طرح قبولِ عام کو کھینچتا ہے، دل دل کے خیال باندھتے، اور اس طرح باندھتے تھے کہ گویا اپنے ہی دل پہ گذری ہے۔" (آب حیات ص ۴۰۶، ۴۳۸ ۔ ۴۴۲)

حالی اور آزاد نے اپنے اپنے استاد کی مدح میں جو کچھ لکھا ہے، ان دونوں میں مبالغہ کا رنگ ضرور آگیا ہے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ آزاد نے اپنی نثر میں شاعری کی ہے، اور حالی نے شاعری میں شاعری کی ہے، شاعری کے لیے مبالغہ بعض اوقات تو حسن اور زیور بن جاتا ہے، لیکن یہ بات کسی بھی نثر کے لیے نہیں کہی جاسکتی ہے۔

حالی کے مرثیۂ غالب کے ایجاز کا اطناب ان کی یادگار غالب ہے، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک بے مثال تصنیف ہے، اور جب تک غالب کا نام زندہ ہے، اُس وقت تک یہ کتاب بھی زندہ رہے گی، غالب کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہوگا، یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ میں غالب کی زندگی کے حالات اور ان کے اخلاق وعادات کا بیان ہے، دوسرے حصہ میں غالب کی اردو شاعری، اردو نثر، فارسی شاعری اور اور فارسی نثر پر ناقدانہ تبصرہ ہے، ان کے بعض اشعار کی شرح کے ساتھ ان کے محاسن کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، اور آخر میں غالب کے فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلّم الثبوت استادوں کے کلام کے ساتھ کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ غالب نے فارسی شاعری میں کس درجہ تک کمال بہم پہنچایا تھا، حالی غالب کے سوانح حیات پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ ان کی نظر میں ان کے استاد کی زندگی میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آیا، لیکن انکے خیال میں ان کی شاعری اور انشا پردازی ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے آخری دور کا

ایک مہتم بالشان واقعہ ہے، یادگار غالب میں اس مہتم بالشان واقعہ کو زیادہ روشن کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حالی کا بیان ہے کہ اس میں غالب کی زندگی کے واقعات ضمنی اور استطرادی طور پر اسلیے لکھ دیے گئے ہیں کہ ایسے باکمال شخص کی زندگی سے ناواقف رہنا قوم کے لیے نہایت افسوس کی بات ہوتی۔

گو غالب کی زندگی کے حالات اس میں ضمنی اور استطرادی ہیں، لیکن اس کے باوجود اس میں غالب کے خاندان، تاہل، مجادلۂ اہل کلکتہ، قیام لکھنؤ، ملازمت سرکاری سے انکار، قید ہونے کے واقعہ، قلعہ کا تعلق، استعداد عربی، فارسی دانی کے علاوہ ان کی وسعت اخلاق، مروت، فراخ حوصلگی، حسن بیان، ظرافت، خودداری، حسن طلب، شوخی بیان، سلامتی طبع، داد سخن، محققانہ نظر، حق پسندی، راست گفتاری، ناقدردانی کی شکایت، خانگی تعلقات، اور موت کی آرزو کی جیتی جاگتی تصویریں اس کتاب میں ملتی ہیں، کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی ہیں، حالانکہ یادگار غالب کے بعد اب تک غالب کی زندگی کے حالات میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان میں غالب کے واقعات زندگی کی تعبیر تو ضرور ہے، لیکن ان میں سے کسی میں حالی کی پیش کردہ تصویر سے بہتر تصویر نظر نہیں آتی،

غالب کی زندگی میں بعض نمایاں کمزوریاں تھیں، جن کا ذکر حالی نے یادگار غالب میں اجمالی طور پر تو کر دیا ہے، لیکن ان کی زیادہ تفصیل نہیں لکھی ہے، اسی لیے ان پر اعتراض ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کی کمزوریوں اور برائیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، یہ صحیح نہیں، حالی ان پر پردہ ڈالنا چاہتے تو ڈال نہیں سکتے تھے، کیونکہ غالب نے خود اپنے اشعار اور مکاتیب میں اپنی برائیوں کی طرف خود ہی اشارہ کر دیا ہے، وہ اپنی بادہ خواری کا ذکر اپنے مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں :-

"دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاسن ٹیلن اور ایک اولڈ ٹام ہمیشہ پیا کرتا تھا اور یہ دونوں قسم بیس روپے مدچوبیس روپے درجن آتی تھی، اب یہاں پہلے تو نظر ہی

نہیں آتی تھی، اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے، وہاں سے تم دریافت کرو اس کا نرخ کیا ہے، اور یہ بھی معلوم کرو کہ بطریق ڈاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں...... جاڑوں میں مجھ کو بہت تکلیف ہے، یہ گڑ چھال کی شراب میں نہیں پیتا، یہ مجھکو مضرت کرتی ہے۔"

وہ اپنے اشعار میں بھی کہتے ہیں :-

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

وہ آخر وقت تک شراب کے دلدادہ رہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دے ابھی ساغر و مینا مرے آگے

وہ قرض لے کر شراب پیتے اور اسکے برے نتائج بھی بھگتتے رہے۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

خود کہتے ہیں کہ اگر وہ بادہ خوار نہ ہوتے تو ولی ہوتے۔

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

جوئے کی علت میں وہ اسیر ہوئے تو اپنی اسیری کے زمانے کی کیفیت کا اظہار بھی ایک شعر میں اس طرح کر دیا ہے :

جس دن سے کہ ہم غمزدۂ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جب کبھی اپنی ناداری کی وجہ سے جوا نہ کھیل سکے تو ان کو بڑا دکھ رہا،

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جاویں گرہ میں مال کہاں

وہ اپنی شاہد پرستی میں آبروئے شیوۂ اہل نظر کے قائل نہ تھے، بلکہ بوالہوس بنکر حسن پرستی کو اپنا شعار بنائے رکھا، شہد کی مکھی کے بجائے مصری کی مکھی بننا پسند کرتے، اسی لیے ان کا خیال ہر گل ولالہ پر دوڑتا، ان کی نگاہ صد گلستاں کا سامان ڈھونڈھتی، ہر نوبہار ناز کو تاکتی رہتی،

ان کو اپنی صورت شکل زیادہ پسند نہ تھی، پھر بھی خوبرویوں کے ساتھ وقت گذارنا چاہتے تھے،

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد　　　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

وہ اپنے خطوط میں ان ستم پیشہ عورتوں کا بلا تکلف ذکر کرتے ہیں جن سے ان کے عاشقانہ نہیں بلکہ فاسقانہ تعلقات تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں "چنا جان نہ سہی منا جان سہی، میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی، اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے، اور اسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے اس تصور سے جی گھبراتا اور کلیجہ منہ کو آتا ہے، ہے ہے، وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی، وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بد دور، (یادگار غالب ص ۱، وخطوط غالب از مہیش پرشاد جلد اول ص ۱۶-۳۱۵)

وہ صوم وصلوٰۃ کے بھی عادی نہیں رہے، کہتے ہیں

جانتا ہوں ثواب طاعت وزہد　　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس پر وہ اظہار تاسف بھی کرتے ہیں،

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ　　　　شرم تم کو مگر نہیں آتی

وہ اپنی ناداری کو دور کرنے کے لیے دستِ سوال بھی دراز کر دیا کرتے تھے، جیسا کہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے،

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب　　　　تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

لیکن ان تمام کمزوریوں اور برائیوں کے باوجود اس کو کیا کیجئے کہ دہلی میں بزم تھی تو ان کی تھی، ذات تو ان کی تھی، دہی شہر کے چراغ اور روشن دماغ رہے، رند تو ضرور تھے مگر مرجع کرام و ثقات تھے۔

حالی یادگار غالب میں اگر اپنے استاد کی تمام برائیوں کو نظر انداز کر دیتے تو الزام کے لائق نہ تھے، کیونکہ مشرقی تہذیب میں بزرگوں کی خطاؤں کی گرفت خود خطا ہے، فن سوانح نگاری کا اعلیٰ معیار تو یہ ضرور ہے کہ جسکے حالات زندگی لکھے جائیں اس میں خوبیاں ہیں تو انکو اچھی طرح روشن کیا جائے لیکن اگر کچھ کمزوریاں ہیں تو ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کیجائے، حالی اس معیار سے ناواقف نہ تھے، انھوں نے اس کا اعتراف اپنی تصنیف حیات سعدی کے دیباچہ میں کیا ہے، لیکن وہ صرف شاعر اور ادیب ہی نہ تھے، وہ اپنے زمانہ کے مصلح بھی تھے، انھوں نے اسی مصلحانہ جذبہ کے ماتحت سوانح نگاری شروع کی، ان کا زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کی ایک عظیم الشان سلطنت مٹ چکی تھی، اور اس کی وجہ سے جو تہذیب وتمدن بنا تھا، وہ انگریزوں کے لائے ہوئے اور آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والے تمدن سے ٹکرا رہا تھا، اور خیال تھا کہ اس تصادم سے ہندوستانی مسلمان اپنی تہذیب اور شاندار روایات کو کھو بیٹھیں گے، حالی کے دردمند اور حساس دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے ایسے بزرگوں کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جنھوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں عمدہ کارنامے چھوڑے ہیں، تاکہ یہ سوانح عمریاں ایک تازیانہ ہوں، اپنے اس خیال کی تائید انگلستان کے مصنف کے قول سے کی ہے کہ ہوا گرانی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کرو، حالی نے حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید لکھیں تو ان میں کسی کی شخصیت میں ان کو کوئی کمزوری نظر آئی تو اس کو بیان کرنے میں ان کے قلم کی روانی ضرور مدھم پڑ جاتی ہے، اور وہ سوانح نگاری کے معیار کے پابند ہونے کے بجائے ان کی خوبیوں اور دلفریبیوں پر مرثیہ زیادہ پسند کرتے ہیں،

اسی مرثیہ کے خیال سے حالی نے لوگوں کو غالب کے ان عجیب و غریب ملکات سے روشناس کیا، جو کبھی نظم و نثر کے پیرایہ میں، کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں، کبھی عشق بازی اور

رند شرابی کے لباس میں، کبھی تصوف اور حب اہل البیت کی صورت میں ظہور ہوتے رہے، لیکن اس کے
باوجود حالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی، اور چوسر جب
کھیلتے تھے تو برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے، اسی چوسر کی بدولت ان کو تین مہینے جیل میں
گزارنے پڑے (ص ۲۷-۲۸) پھر وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ مرزا نماز پنجگانہ کے پابند نہ تھے،
(ص ۵۰) پھر ان کے ناؤ نوش کی تفصیل تو بہت ہی دلچسپ انداز میں لکھی ہے (ص ۷۶...
ان کی شاہد پرستی کا بھی ذکر کیا ہے، (ص ۱۰۶) لیکن یہ حالی کے قلم کا جادو ہے کہ غالب کی ان
کمزوریوں کو پڑھنے کے بعد تکدر پیدا ہونے کے بجائے لبوں پر تبسم آجاتا ہے، اور غالب کے سارے
عیوب حالی کے بیان کیے ہوئے لطیفوں کی پھلجھڑیوں میں گم ہو جاتے ہیں، جو پوری کتاب میں
اس طرح سجائے گئے ہیں جیسے آرٹ گیلری میں نادر تصویریں رکھی جاتی ہیں، غالب کی زندگی کے
بعض پہلو جو صفحے کے صفحے لکھنے کے بعد بیان کیے جا سکتے، حالی نے ان کو ایک دو لطیفوں میں واضح کر دیا
ہے، اس میں حالی کے دلنشین طرز ادا کو بھی بڑا دخل ہے، انھوں نے اپنے قلم کے آرٹ سے غالب کی
کمزوریوں کی طرف پڑھنے والے کا ذہن تو ضرور متوجہ کر دیا لیکن ان کمزوریوں سے متاثر ہونے
نہیں دیا، حالی اس حیثیت سے یادگار غالب میں بڑے آرٹسٹ نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ انھوں نے
غالب کے شاعرانہ کمالات اور ذاتی اوصاف کے طرح طرح کے محاسن کو اچھال کر لوگوں کے ذہن
میں ان کی عظمت کا ایسا سکہ جما دیا کہ ان کی ساری کمزوریاں ان کی اور دوسری خوبیوں کے سامنے
ماند پڑ جاتی ہیں، اکرام نے غالب نامہ میں یادگار غالب کو شاید اسی لحاظ سے سوانح نگاری کا معجزہ
کہا ہے، اور یہ لکھ کر حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے، ابھی تک حالی
سے آگے کوئی نہیں بڑھا (غالب نامہ ص ۱۰۴) اور حالی نے مرزا کے اخلاق و عادات کی جو تصویر
یادگار غالب میں کھینچی ہے، اس میں اضافہ کی گنجائش بہت کم ہے اور شاعری کی شہرت کی بنیاد شاید دیوان غالب

سے بھی زیادہ مولانا حالی کے اس شاہکار پر ہے (ص ۱۵۵)
حالی نے اپنی اس کتاب میں غالب کے کلام کی گوناگوں خصوصیات، ان کے معانی و مطالب،
حسن بیان کی خوبیاں، طرز ادا کی ندرتیں، زبان کی نزاکتیں کچھ اس دلکش انداز سے پیش کی ہیں
کہ ڈاکٹر عبد الحق کی اس رائے سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ "حالی نے غالب کے کلام کے حسن و کمال
کو ایسے دل آویز طریقے سے بیان کیا ہے کہ عام و خاص دونوں پر ان کی اصلی قدر و قیمت آشکارا
ہو جاتی ہے، اور یہ اسی کتاب کا طفیل ہے کہ اس کے بعد سے سینکڑوں مضامین اور بیسیوں
شرحیں مرزا غالب کے کلام پر لکھی گئیں"
حالی غالب کے نوادر افکار کو قوم تک پہنچانا چاہتے تھے اور انھوں نے اسکو کامیابی کے ساتھ پہنچا دیا، غالب کی
شاعری ایک معمہ تھی لیکن حالی نے اسکی برتری کو محسوس کیا، اور دوسروں کو محسوس کرایا اور اب اس حقیقت کو
سبھوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ اگر یادگار غالب نہ لکھی گئی ہوتی تو غالب نے اردو شاعری کو جو
کچھ عطا کیا تھا، وہ قوم تک منتقل ہونے سے رہ جاتا، یادگار غالب ہی کے ذریعہ غالب کی
شاعری کو لوگ سمجھے اور سمجھ کر جھومنے پر آمادہ ہوئے اور حالی نے جس اختصار، اجمال
اور جامعیت سے غالب کو سمجھایا ہے، اسی کی شرح اور وضاحت اب تک ہوتی رہی ہے،
حالی نے غالب کی شاعری کی جو خصوصیات بتائی ہیں، ان کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ
میں یہ ہے:-

مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا، چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی
زبان میں اختراع کی تھی، اسی پر انھوں نے چلنا اختیار کیا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار یہ ہیں:-

کرے گر فکر تعمیر خرابی ہائے دل گردوں — نہ نکلے خشت مثل استخواں بیروں ز قالب ہا

اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن — بہ بند گریہ ہے نقش بر آب امید رستن ہا

بحسرت گاہ ناز کشتۂ جاں بخشیِ خوباں — خضر کو چشمۂ آب بقا سے ترجبیں پایا

رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ — اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش — خیالِ شوخیِ خوباں کو راحت آفریں پایا

یہ طرز بیان اردو بول چال کے خلاف تھا، اس لیے خیالات میں کوئی لطافت نہیں ہے (ص ۱۰۱-۱۰۲)

یہ اشعار مرزا کی ان نظری غزلوں کے ہیں جو انھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالے تھے، مگر اب بھی ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن پر اردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے، مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ انداز بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط — تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا — تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہوں گے، جب اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا، ظاہراً یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے، انکے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا، ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار انکی نظر میں کھٹکتے ہوں

گر چونکہ دیوان شائع ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا....." (ص ۱۰۷)

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی، اس لیے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے ان کو بہت تنبہ ہوتا تھا، آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہ پر آنے لگی، اس کے سوا جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا ان کو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی، یہاں تک کہ ان ہی کی تحریک سے انھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اس وقت موجود تھا، دو ثلث کے قریب نکال ڈالا، اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا......" (ص ۱۱۰-۱۰۹)

مرزا نے ریختے میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی، ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہو سکتی تھی، ان کے اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر ان میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے...... مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی غیر معمولی اپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے، اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں اُن کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں......" (ص ۱۱۱)

بہر حال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بے راہ روی سے خبردار ہوئے اور استقامت طبع اور سلامتی ذہن نے ان کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا، گو ان کا ابتدائی کلام مقبول نہ ہوا، مگر چونکہ قوت متخیلہ سے بہت زیادہ کام لیا گیا تھا، اس لیے اس میں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی، جب قوت ممیزہ نے اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے....." (ص ۱۱۳)

میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ

مضامین صدیوں اور قرنوں سے فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں، وہی مضامین بہ تبدیلی الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامۂ اہل زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ میں ادا کیے جائیں ...... برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے، ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے ......” (ص ۱۱۶)

عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں، مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے ان تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں، وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ خیالات کی جدت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کی ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں، وہ اکثر غرائب سے خالی نہیں ہیں، مثلاً سانس کو موج سے، بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغز سر کو پنبہ بالش سے، دانۂ انگور کو عقد وصال سے، استخوان کو خشت اور بدن کو قالب خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختہ میں پائی جاتی ہیں، لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی، اسی قدر تشبیہوں میں باوجود ندرت اور طرفگی لطافت بڑھتی گئی۔
(ص ۱۲۲-۱۲۱)

استعارہ و کنایہ و تمثیل ادب کی جان اور شاعری کا ایمان ہے، اس کی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے، مرزا نے ریختہ میں بھی نسبتہً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا ہے، اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اردو میں بلاشبہ استعمال کیا ہے لیکن

استعارے کے قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں، مرزا کے یہاں استعارے بلاقصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں ......” (ص ۱۲۴)

مرزا کے یہاں باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی اور ظرافت بھی ہے، ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گزرے ہیں، ایک سودا دوسرے انشا، مگر دونوں کی تمام شوخی اور خوش طبعی، ہجوگوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی، بخلاف مرزا کے کہ انھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبان و قلم کو آلودہ نہیں کیا ......” (ص ۱۲۵)

مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے، جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے ...... ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی و مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں لطف اٹھا نہیں سکتے ......” (ص ۱۲۶)

جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی، خسرو، حافظ اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً وہی نسبت مرزا کے ریختہ کو میر، سودا، اور درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہیے، قدما اردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے، برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمال شاعری سمجھتے تھے، اور زبان کی صفائی اور روزمرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ نہ کہ مقصود شاعری تصور کرتے تھے، چنانچہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں کہ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں،
(ص ۱۳۳-۱۳۲)

حالی نے اوپر جو کچھ کہا ہے، اس کے ثبوت میں غالب کے اشعار بھی نقل کیے ہیں، اور ان اشعار کی تشریح کرکے جا بجا ان کی خوبیاں بھی دکھائی ہیں، اس طرح غالب کے بہت سے اشعار کی شرح بھی ہوگئی ہے، جس کے دو تین نمونے یہاں پر پیش کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ یہ اندازہ ہو کہ غالب نے اپنے سینہ سے جو چیز سفینہ میں منتقل کی، اس امانت کو حالی نے قوم تک کیسے پہنچایا، پھر ان ہی کی شرح کا انداز بیان کلام غالب کے آیندہ شارحین کے لیے مشعلِ راہ بن گیا۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکے کھائیں کیا

حالی۔ لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت، یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا، اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت سے ہرگز باندھا نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے، نہ دوستی، اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لیے اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے، ہم اس کو دوستی سمجھتے، لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات کا دھوکا کھائیں، قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں، اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے۔ (ص ۱۱۸)

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز　　　دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

حالی۔ چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لیے پہلا مصرع اردو روزمرہ سے کسی قدر بعید ہوگیا، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی، کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو، یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہے۔" (ص ۱۱۹)

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

حالی۔ سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے، اس کو شہود کہتے ہیں، اور غیب الغیب سے مراد احدیت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الورا ہے، کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے، اور اس کو غلطی سے شہود سمجھے ہیں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں، پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے، یہ مثال بالکل نئی ہے، اس سے بہتر اس مضمون کے لیے مثال نہیں ہو سکتی۔ (ص ۱۲۰)

شرح کی ان دو تین مثالوں کے بعد کچھ مثالیں ہم ایسی بھی پیش کرتے ہیں جن میں حالی نے بعض اشعار کی تعریف خاص طور پر کی ہے، ان کو نقل کرتے وقت شرح کو لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں　　　جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

حالی۔ ان اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں، مگر استعارے اور تمثیل نے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کر دی ہے۔ (ص ۱۲۵)

ستایش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا　　　وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

حالی۔ بے خودوں کی بہشت کو گلدستۂ طاقِ نسیاں سے تشبیہ دینا بالکل ایک نرالی تشبیہ ہے، جو کہیں نہیں دیکھی گئی۔ (ص ۱۳۴)

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟　　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

حالی۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں ہے، بلکہ عبودیت ہے، بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا　　　بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

حالی۔ پہلے مصرع کا دوسرا رکن یعنی "پھر بیاں اپنا" سارے شعر کی جان ہے، جس کی خوبی بغیر ذوقِ سلیم کے معلوم نہیں ہو سکتی (ص ۱۳۶)

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ ہے پا رکاب میں

حالی۔ عمر کو بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسن تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے۔ (ص ۱۴۳)

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیا سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

حالی۔ وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے، بالکل نیا پیرایۂ بیان ہے (ص ۱۵۴)

رونے سے اور عشق میں بےباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

حالی۔ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے (ص ۱۵۵)

حالی ایک بے مثل شاعر ہونے کے ساتھ شعر فہمی کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اسی غالب کا کلام ان سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا، وہ ان کی شاعری کو حسن و جمال کی صورت اور عظیم الشان واقعہ ضرور سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان کے بعض اشعار کو مہمل اور بے معنی، اور ان کی بعض تشبیہوں کو عجیب و غریب قرار دینے میں تامل نہیں کیا ہے، وہ اگر اپنے استاد کی محبت کے غلو میں ان کی شاعری کا وصف بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیتے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن انھوں نے عقیدت کے بجائے حقیقت پسندی کو راہ دیا، اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے غالب کی شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں کبھی کہنگی پیدا نہ ہوگی، بلکہ ہر زمانہ میں ایک تازگی محسوس ہوتی رہے گی،

حالی نے غالب کی اردو قصیدہ نگاری پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مرزا کے اردو کلام میں ... غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں" (ص ۱۱۵) لیکن

موجودہ دور کے کچھ نقاد ایسے بھی ہیں جو اُن کی اردو قصیدہ نگاری کی خوبیاں بھی ظاہر کرنے میں آگے ہیں، ایسے نقادوں کو حالی کی اس رائے سے شاید اتفاق نہ ہو، کیونکہ جس طرح غزل گوئی میں غالب نے اپنی انفرادیت کو نمایاں کیا، اسی طرح ان کی اردو قصیدہ نگاری میں ان کے انفرادی کمال کی جھلک موجود ہے،

حالی غالب کی اردو نثر کو غنج و دلال کی صورت بتاتے ہیں، موجودہ لوگوں کو حالی کے اس بیان سے شاید اتفاق نہ ہو کہ "جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندستان میں جس قدر ان کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے، ویسی نظم اردو اور نظم فارسی سے نہیں ہوئی (ص ۱۶۶)، لیکن حالی کی اس رائے سے شاید ہی کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ اگرچہ مرزا کے بعد نثر اردو میں بے انتہا وسعت اور ترقی ہوئی ہے، لوگوں نے علمی، اخلاقی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مضامین کے دریا بہا دیے ہیں، سوانح عمری اور ناول میں بھی متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، اس کے باوجود مرزا کی تحریر خط و کتابت کے محدود دائرے میں بلحاظ دلچسپی اور لطف بیان کے اب بھی اپنا نظیر نہیں رکھتی (ص ۱۷۰)۔ انھوں نے مرزا کی مکتوب نگاری کی خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے پہلی دفعہ بتایا کہ ان کی خط و کتابت کا طریقہ سب سے نرالا ہے، نہ ان سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اسکی پوری تقلید ہو سکی، انھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جن کو مترسلین نے لوازمِ نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا، مگر درحقیقت فضول اور دوراز کار تھیں، سب اڑا دیں، ان کے ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں، بعض جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے وقت اس کو غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ مرزا کے انداز بیان سے واقف نہیں وہ اس کو مکتوب الیہ

کا غیر سمجھ لیتے ہیں، وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنادیا وہ
شوخیِ تحریر ہے جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہوسکتی، بعض لوگوں نے
خط و کتابت میں مرزا کی روش پر چلنے کا ارادہ کیا اور اپنے مکاتبات کی بنیاد بذلہ سنجی و ظرافت
پر رکھنی چاہی، مگر ان کی اور مرزا کی تحریریں وہی فرق پایا جاتا ہے جو اصل اور نقل یا روپ اور
بہروپ میں ہوتا ہے، مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی
ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ ہو اور خوش ہو، پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ
ہوتا تھا، اس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے، بعض خطوط میں یاس و حسرت،
افسردگی اور دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا بیان نہایت مؤثر طریقہ میں کیا ہے، جس سے
ان کے خیالات معلوم ہوتے ہیں، مرزا کے خطوط میں مقفّٰی عبارتوں کی بھی مثالیں ہیں، اگرچہ معلوم ہے
کہ مقفّٰی عبارت مرزا خاص کر ان خطوط میں لکھتے تھے جن سے ہنسی، ظرافت اور مخاطب کا خوش
کرنا مقصود ہوتا تھا، ورنہ واقعات کا بیان، مصائب کا ذکر یا تعزیت یا ہمدردی کا اظہار
ہمیشہ سیدھی سادی نثر عاری میں کرتے تھے۔

حالی نے غالب کی نثر نگاری کا جو صحیح بلکہ دلچسپ اور دلکش تجزیہ کیا ہے، اسی کی شرح
مختلف انداز میں بعد میں ہوتی رہی، انہی کی بدولت پہلی دفعہ غالب کی نثر نگاری کے حسن و
جمال کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی، اس وقت سے اب تک اہل قلم نے غالب کی
مکتوب نگاری پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ان کی تحریروں سے کمیت میں تو ضرور اضافہ ہوا ہے
لیکن حالی کے تبصرہ میں جو کیفیت ہے، اس سے کوئی بازی نہ لیجا سکا ہے، موجودہ دور میں
غالب کی شعرگوئی کی مقبولیت میں ان کی نثر نگاری کی اہمیت ضرور دب گئی ہے لیکن موجودہ
اردو نثر نگاری کا ابوالآبا، انہی کو کہا جاسکتا ہے، جب اردو کے نثر نگار ایک ایسے

اسلوب بیان کی تلاش میں سرگرداں و حیران تھے جس کے سہارے وہ عام فہم سلیس
اور آسان اردو میں اپنے اپنے علمی و ادبی ضمیر کا اظہار کرسکیں، تو غالب ہی نے اپنے
خطوط کے ذریعہ ایک ایسا طرز بیان عطا کیا جس کی تقلید تو نہ ہوسکی، لیکن اس کی وجہ سے
اردو نثر نگاری کی ایک شاہراہ بن گئی جس پر تمام ارباب قلم چل نکلے، غالب اردو میں
کوئی مضمون یا کتاب تو نہیں لکھ سکے، لیکن ان کی اردوے معلی اور عود ہندی اردو نثر نگاری
کے راس المال ہیں جن کی نسبت بقول حسرت موہانی بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ
انشا پردازی کی بنا انہی نے ڈالی۔ (دیباچہ شرح دیوان غالب از حسرت موہانی ص ۹)

حالی کا قلم غالب کی فارسی نظم و نثر کے محاسن دکھانے میں زیادہ رواں ہوگیا ہے،
یادگار غالب میں غالب کے حالات اور ان کی اردو شاعری و نثر پر صرف ۱۰۸ صفحے ہیں،
لیکن ان کی فارسی نظم و نثر پر ۳۲۳ صفحے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ اس عنوان پر کتاب کا
زیادہ حصہ مشتمل ہے، لیکن ہم غالب کی اردو شاعری کی مدح و قدح پر زیادہ زور دینا
چاہتے ہیں، اور ان کی فارسی شاعری اور نثر پر صرف سرسری جائزہ لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حالی ایک تمہید کے بعد غالب کی فارسی شاعری سے متعلق ان کے بعض معاصرین کی
رائے نقل کرتے ہیں، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں
کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا، اور وہ مقطع یہ ہے:

توبریں شیوۂ گفتار کہ داری غالب   گر ترقی نہ کنم شیخ حزیں را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا، اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل
مبالغہ نہیں ہے، مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے، ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم
کی تعلیوں سے خوب واقف تھے، یہ حکایت سن کر کہا کہ مومن خاں نے یہ اس لیے کہا کہ وہ اپنا

رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے برتر و بلند تر سمجھتے تھے، ورنہ وہ ہرگز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔(؟)
نواب ضیاء الدین خاں کا مرزا کی نسبت یہ قول تھا کہ ہندوستان میں فارسی شعر کی ابتدا ایک ترک لاچین یعنی امیر خسرو سے ہوئی، اور ترک ایبک یعنی مرزا غالب پر اس کا خاتمہ ہو گیا، سید غلام علی وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عرب کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابو تمام ہوتا، اور اگر انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا۔ (ص ۱۹۳-۱۹۲)

آگے چل کر حالی نے غالب کی اس فارسی تحریر کا اردو ترجمہ دیتے ہیں جو غالب کے فارسی دیوان کا دیباچہ ہے، اس میں غالب خود رقمطراز ہیں کہ اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی، لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے، آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے، دیکھا کہ میں باوجود یکہ اپنے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی، شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا، ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زاد راہ باندھا، اور نظیری نے اس خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا، اب اس گروہ والاشکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا۔" (ص ۱۹۵)

حالی کو اپنے استاد کی اس رائے سے مکمل اتفاق نہیں ہے، اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ مرزا کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ وہ غزل میں نظیری کی روش پر چلتے تھے، مگر ان کی غزلیات

کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکی غزل میں نہ صرف نظیری، بلکہ عرفی، ظہوری، طالب آملی، جلال اسیر اور ان کے دیگر متبعین کی غزل کا رنگ علی العموم پایا جاتا ہے، البتہ اس لحاظ سے کہ تصوف کا عنصر مرزا کے کلام میں نظیری سے کچھ کم نہیں ہے، ان کی غزل بلاشبہ نظیری کی غزل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، لیکن طرز بیان کے لحاظ سے نظیری کی کچھ خصوصیت نہیں معلوم ہوتی"۔ (ص ۱۹۵)

اس کے بعد حالی ۲۸ صفحے میں غالب کے فارسی اشعار کی تشریح کرتے ہیں، جن میں توحید، مناجات، نعت کے علاوہ متصوفانہ، عاشقانہ، رندانہ، فخریہ اور اخلاقی اشعار بھی ہیں، مرزا کے کلام میں بڑی شوخی بھی ہوا کرتی تھی، ایسے اشعار کی بھی وضاحت کی گئی ہے اسکے بعد نظیری اور غالب کی ایک ہم طرح غزل کا موازنہ ہے جس کا قافیہ اور ردیف بلا خفت است ہے، اس پر بحث کر کے حالی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہیئت مجموعی کے لحاظ سے مرزا کی غزل نظیری کی غزل سے یقیناً بڑھ گئی ہے لیکن ایک آدھ غزل میں نظیری سے سبقت لیجانے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کی غزل کو مطلقاً نظیری کی غزل پر ترجیح دیجائے، ...... اس غزل کے سوا اور جس قدر غزلیں مرزا نے نظیری کی غزلوں پر لکھی ہیں ان میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو گی جس میں نظیری کی غزل کا پلہ مرزا کی غزل سے غالب نہ ہو۔ (ص ۲۶۱-۲۵۵)

اس کے بعد حالی، ظہوری اور غالب کی ایک ہم طرح غزل کا موازنہ کرتے ہیں، اس کے قافیے اور ردیف خرم و مستمند است اور بند است ہیں، اس میں غالب کو جدت، صفائی، بلاغت، لطافت گرمی، تناسب اور حسن وغیرہ کے لحاظ سے ظہوری سے بہتر قرار دیتے ہیں، (ص ۲۶۰-۲۶۲)

غالب کی رباعیات پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی لکھتے ہیں کہ ان میں اکثر شوخی، بے باکی،

بادہ خواری، فخر و مباہات، اور شکایت و زارنالی کے مضامین پر مشتمل ہیں، اور کسی قدر متصوفانہ اور چند خاص مضامین پر ہیں، خمریات میں ظاہراً عمر خیام کا تتبع معلوم ہوتا ہے، مرزا کی رباعی میں بہ نسبت عام غزلیات کے زیادہ صفائی، شگفتگی اور گرمی پائی جاتی ہے، پھر کچھ وہ رباعیوں کی شرح پیش کرتے ہیں،

غالب کے قصائد کے متعلق حالی تحریر کرتے ہیں کہ قصائد میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے، کہیں سلمان و ظہیر کا اور کہیں عرفی و نظیری کا اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے، مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے (ص ۲۷۹)۔ اس تبصرہ میں بھی حالی نے غالب اور نظیری کے قصائد کا موازنہ کیا ہے، اور دونوں میں جو خوبیاں ہیں ان کو بتایا ہے، اس طرح یہ ظاہر کیا ہے کہ غالب نے نظیری کے رنگ میں کامیابی کے ساتھ قصیدے کہے ہیں، (ص ۲۸۰) خود غالب کو اپنے فارسی قصائد پر بڑا ناز تھا، وہ تو اپنی ریختہ کی شاعری ہی کو اپنے لیے ننگ اور اپنے رنگ سے بے رنگ، اور اپنے نخلستان فرہنگ کا برگ وزم سمجھتے ہے، لیکن اسی برگ وزم نے ہندوستان میں ان کو زندۂ جاوید کر دیا ہے، وہ فارسی کے قصائد میں ایران کے اساتذہ کا رنگ دکھانے کی کوشش تو ضرور کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ فارسی شعراء کی سی بھٹی مجھے ایک نہیں بھاتی، ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں قصائد کی تشبیب میں تو میں بھی جہاں عرفی و انوری پہنچے ہیں، افتاں و خیزاں پہنچ جاتا ہوں، مگر مدح و ستائش میں مجھ سے ان کا ساتھ نہیں دیا جاتا۔

حالی نے غالب کی مثنویوں پر تفصیلی بحث نہیں کی ہے، صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے، کہ مرزا نے کوئی مبسوط مثنوی نہیں لکھی، ان کے کلیات میں گیارہ مثنویاں ہیں، جن میں سب

بڑی مثنوی ۹۲۸ بیت کی ہے، اس کا نام ابر گہربار بتایا ہے، اس میں ان کا ارادہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات بیان کرنے کا تھا، لیکن یہ مکمل نہ کر سکے، حالی کی رائے ہے کہ یہ مثنوی ان کی تمام مثنویوں میں ممتاز ہے۔ (ص ۳۱۳)

آخر میں غالب کی نثر پر بحث ہے، جس کے متعلق حالی کا بیان ہے کہ مرزا کی فارسی نثر مقدار میں فارسی نظم سے بہت زیادہ ہے، لیکن چونکہ وہ وزن سے معرا ہے، اس لیے صرف ایشیائی اصطلاح کے موافق نثر کہا جا سکتا ہے، ورنہ اگر وزن سے قطع نظر کی جائے تو ان کی نثر میں شاعری کا عنصر نظم سے بھی غالب تر معلوم ہوتا ہے...... پھر بھی انھوں نے نثر فارسی میں بھی اسی قدر بلند پایہ پہنچایا تھا، جیسا کہ نظم فارسی میں ان کو حاصل تھا، یہ رائے ظاہر کرکے وہ غالب کی مہر نیمروز، دستنبو اور ان کے مختلف دیباچوں اور خطوں سے ان کی نثر کے نمونے پیش کرتے ہیں، اس کے بعد ظہوری، حزیں اور مرزا ابوالفضل کی نثر سے غالب کی نثر کا مقابلہ کرتے ہیں

ان تمام مباحث کا لب لباب خود حالی کی زبان میں یہ ہے کہ غالب کا مرتبہ قصیدہ اور غزل میں عرفی اور نظیری کے لگ بھگ اور ظہوری سے بڑھا ہوا، مثنوی میں ظہوری کے لگ بھگ اور عرفی و نظیری سے بالا اور نثر میں تینوں سے بالاتر ہے۔ (ص ۴۰۹) ایک اور جگہ حالی لکھتے ہیں کہ غالب کے قصیدے انوری و خاقانی کے قصیدے سے ٹکر کھاتے ہیں، انکی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لیجاتی ہے، اور وہ رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملاتے ہیں (ص ۱۹۰)۔ جب کہ ہندوستان میں فارسی کی قدر دانی ختم ہوتی جارہی ہے، تو اب یہ ایران والوں کے ذوق کی آزمائش ہے کہ وہ غالب کی فارسی شاعری کو سبک ہندی قرار دیکر نظر انداز کر دیں یا حالی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اتفاق کریں۔

ایران والے اپنے سبک کے پندار میں غالب کو اپنے یہاں وہ درجہ نہ دیں جس کے وہ مستحق ہیں لیکن غالب خود سبک ایرانی کے دلدادہ رہے، اور اس کے لیے اپنے ہم وطنوں کے طنز و تعریض کے شکار بھی ہوئے، ان کا کلکتہ کا ادبی مجادلہ مشہور ہے، وہاں کے ایک مشاعرہ میں ہمام تبریزی کی زمین میں ایک غزل پڑھنی شروع کی، جب یہ شعر پڑھا

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئے کہ بتاں را ز میاں برخیزد

تو اس پر حاضرین نے اعتراضات کیے کہ مصرع اولیٰ میں بیش کی جگہ بیشتر اور مصرع ثانی میں موئے ز میاں کی ترکیب غلط ہے، بلکہ پورا شعر بے معنی ہے، ہمہ عالم کی ترکیب پر بھی اعتراض ہوا کہ عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ ممنوع ہے، اور سند میں قتیل کا حوالہ دیا گیا، غالب نے قتیل کا نام سنکر ناک بھوں چڑھائی، اور کہا کہ میں دیوالی سنگھ (قتیل کا غیر اسلامی نام) فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا، اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کیے، اس سے معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا، اور مرزا پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی، یہانتک کہ بعض ان پر آوازے کسنے لگے، اس سے گھبرا کر انھوں نے اپنی مثنوی باد مخالف میں معذرت مانگی (یادگار غالب ص ۲۰، ذکر غالب از مالک رام ص ۴۸ - ۴۷) لیکن اس کے باوجود آخر وقت تک سبک ایرانی سے ان کی دلدادگی اور شیفتگی نہیں گئی، فارسی کے باکمال ہندوستانی نثر نگار و شاعر معلوم نہیں کتنے پیدا ہوئے ہیں، ان میں ابو الفرج رونی، مسعود سعد سلمان، تاج الدین ریزہ، شہاب الدین مہمرہ، امیر خسرو، حسن دہلوی، فیضی، اور عبد القادر بیدل کے نام زیادہ نمایاں ہیں، لیکن غالب خسرو کے سوا کسی اور کو تسلیم نہیں کرتے، اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

غالب کہتا ہے کہ ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا، خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے، یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے، خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے، کلام اسکا پسندیدۂ جمہور ہے، دیکھو عبدالقادر بدایونی کیا کہتا ہے، "زہے سیاہی فائز"(؟) آمدہ و فقیر [illegible] اور بہار وغیرہم ان ہی میں آگئے، ناصر علی اور بیدل اور غنیمت ان کی فارسی کیا، ہر ایک کا کلام بنظر انصاف دیکھیے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، منت اور مکین اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے، ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں، خیر ہوں، فاضل کہلائیں، کلام میں ان کے مزا کہاں، فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، اس میں پیروی قیاس ایک بلائے عام ہے، وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور ہر اعتراض بجا ہے، بایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے، مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی، اس شیوۂ روش کو خوب برت گئے، فارسی وہ کیا جانیں، قاضی محمد صادق اختر عالم ہوں گے، شاعری سے ان کو کیا علاقہ

(ادبی خطوط غالب از مرزا محمد عسکری، ص ۳۴ - ۳۳)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے، پھر تتبع کلام اہل زبان، لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اسکے کہ انکی موزونی طبع کا نتیجہ کہیے اور کسی تعریف کے شایان شان نہیں ہیں، نہ ترکیب فارسی، نہ معنی نازک، ان الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں اور جو متصدی نثر میں درج کرتے ہیں، وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں خرچ کرتے ہیں، اجب رودکی و عنصری

دخاقانی و رشید وطواط اور ان کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے۔" (ادبی خطوط غالب، ص ۵)

ایرانی طرز شاعری کی اداؤں پر جان دینے کے باوجود غالب کو ایران میں کوئی مقبولیت حاصل نہ ہوسکی، ابوالفرج رونی نے تو انوری سے اپنی برتری تسلیم کرالی، جیسا کہ انوری نے یہ اشعار کہے

باد معلومش کہ من بندہ بشعر بوالفرج | تا بدیدستم ولوعی داشتستم بس تمام

از متانت خیل اقبالت چو شعر بوالفرج | وز عذوبت مشرب عیشت چو نظم فرخی

اسی طرح ایرانی تذکرہ نگار مسعود سعد سلمان لاہوری کی تعریف "از نوادر ایام و افاضل انام" لکھ کر کرتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ اس کا دیوان عراق، عجم اور طبرستان میں عظیم شہرت رکھتا ہے۔ (تذکرۂ دولت شاہ ص ۴۰) - فلکی شیروانی نے مسعود سعد سلمان کو خراج تحسین یہ کہہ کر پیش کیا ہے:

گر ایں طرز سخن در شاعری مسعود را بودی | بجاں صد آفریں کردی روان سعد سلمانش

سنجر کے ملک الشعرا نے اس کے بارہ میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ قرآن پاک کے بعد اسی کے اشعار اچھے ہیں،

در مجلس بزرگی خالی مباد ہرگز | پیرایۂ بزرگی مسعود سعد سلمان

آن شاعر سخنور کز نظم او نکوتر | کس در جہاں کلامی نشنید بعد قرآن

دولت شاہ سمرقندی نے نہ صرف امیر خسرو کی تعریف کی ہے، بلکہ خواجہ حسن دہلوی کو بھی شیریں کلام کہا ہے، اور ان کی شاعری کو سخن پر حال بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ انکی ایک غزل کا مطلع یہ ہے:

ساقیا مے دہ کہ ایں خاست از خاور سفید | سرو را سر سبز شد صد برگ را چادر سفید

اس کا جواب آج تک کسی سے نہ ہوسکا (تذکرۃ الشعراء ص ۲۴۹)

جامی نے بھی بہارستان میں ان کی غزل کے طریق خاص کی تعریف کی ہے (ص ۹۱)

ظہیری ترشیزی نے فیضی کے کلام کی لطافت، رطوبت اور طراوت کی تعریف کی ہے،

شاہ عباس اول کے ملک الشعرا علی نقی کامرانی نے تو فیضی کو اپنا استاد تسلیم کرلیا تھا،

مرا بر انگندم بر نظم امورم پر توے فیضی | ابوالفیض آں گزین اکبر و شیخ کبیر من

ایران کے ایک اور دستی قلندری نے فیضی کے متعلق لکھا ہے،

ز فیضی نام تو فیضی گرفت چوں خسرو | بہ تیغ ہندی اقلیم سبعہ را یکسر

عبد القادر بیدل ایران میں تو مقبول نہ ہوسکے لیکن افغانستان میں آج بھی ان کی شاعری کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی ہے، افغانستان کے گذشتہ فرمانرواؤں میں سے امیر حبیب اللہ نے ان کا دیوان اپنی نگرانی میں طبع کرایا، ترکستان میں تو ان کی قدر مولانا رومی کی طرح کی جاتی ہے، (آب حیات ص ۱۰۸)

لیکن اس سو سال کے اندر ایران یا افغانستان اور ترکستان میں غالب شناسی کا کوئی ثبوت نظر نہیں آتا، یہ یا تو ان ملکوں کے ارباب کمال کی تحسین ناشناسی کی دلیل ہے، یا غالب کی بدقسمتی کی، حالانکہ غالب ہندوستان کے بجائے اصفہان، ہرات، قم، عجم اور شیراز ہی کے نام پر جھومتے رہے۔

غالب زہند نیست نوائی کہ می کشم | گوئی ز اصفہان و ہرات و قیم ما

غالب سخن از ہند بروں بر کہ کس اینجا | سنگ از گہر و شعبدہ از اعجاز نداند

گرفتہ غالب ہندو ا عیانش | بران سرشت کہ آوارۂ عجم گردد

غالب از آب و ہوائے ہند بسمل گشت
خیز تا خود را به اصفہان و شیراز افگنم

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اصفہان، ہرات، قم اور شیراز والوں کے بجائے ہندوستان ہی کے لوگوں نے ان کی شاعری کو گہر اور اعجاز قرار دیا۔

غالب اور اقبال یادگار غالب کے بعد غالب پر اقبال نے جو نظم لکھی، اس سے انگریزی داں طبقہ کی نظر غالب کی طرف خاص طور پر اٹھی، اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں غالب کو جو خراج عقیدت پیش کیا، وہ ان کی بڑی سوچی سمجھی ہوئی رائے پر مبنی تھا، کیونکہ انھوں نے اپنے دور عروج اور کمال شہرت کے زمانے میں اس میں کوئی ترمیم کرنا پسند نہیں کیا، جس کے معنے یہ ہیں کہ اسلام کا یہ مفکر اور اسرار خودی کا یہ علمبردار بھی ان کی عظمت کے سامنے جھکا رہا، انھوں نے غالب کے فردوس تخیل میں قدرت کی بہار دیکھی، اور ان کو غالب کی کشت فکر میں عالم سبزہ وار نظر آیا، ان کی شوخی تحریر میں زندگی مضمر پائی، پھر اس کا اعتراف کیا کہ ان کے لب اعجاز پر نطق کو سو ناز ہیں اور ان کی رفعت پرواز پر ثریا بھی محو حیرت ہے، ان کے انداز پر شاہد مضمون بھی تصدق ہوا، اور پھر ان کی شاعری کو ایران کی شاعری سے بہتر قرار دیا ہے، اور پھر یہ بھی اعلان کیا کہ ان کے لطف گویائی میں کوئی ہمسری نہیں کر سکتا، یورپ کے شاعروں میں ان کو جرمنی کے شاعر گیٹے کا مدمقابل قرار دیا، اور غایت عقیدت میں یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ دہلی کی خاک میں بہت سے شمس و قمر خوابیدہ ہیں، لیکن ان میں غالب جیسا فخر روزگار اور موتی آبدار نہیں، اس سے بڑھ کر اور کسی کی عقیدت نہیں ہو سکتی ہے، جن ناظرین کی نظر سے یہ نظم نہ گذری ہو، تو ان کے لیے ذیل میں یہ درج ہے :-

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

تھا سراپا روح تو، بزم سخن پیکر ترا
زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوز زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفل ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار

تیرے فردوس تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشت فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

شاہد مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطف گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہم نشیں

ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سر زمیں
آہ! اے نظارۂ آموز نگاہ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در

ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

غالب اور علی حیدر طباطبائی یادگار غالب کے بعد غالب کے کلام کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، مولانا حسرت

موہانی نے اپنی شرح میں یادگار غالب کے علاوہ تین شرحوں کا ذکر کیا ہے، ایک تو شوکت میرٹھی کی ہے، جس میں بعض اشعار کے سات سات معنے بیان کرکے داد تحقیق مزید دی گئی ہے، لیکن خود مولانا حسرت موہانی کا بیان ہے کہ ان دقیق مطالب کے سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے سے وہ محروم رہے، اس کے بعد والہ حیدرآبادی نے وثوق صراحت کے نام سے ایک شرح لکھی، جو بقول مولانا حسرت موہانی مفید اشاروں کا مجموعہ ہے، یہ دونوں شرحیں میری نظر سے نہیں گذریں، ان کے بعد سید علی حیدر طباطبائی کی نظم کی شرح منظر عام پر آئی، جو بہت مقبول ہوئی، میرے پیش نظر اس کا جو مطبوعہ نسخہ ہے، اس میں سنہ طباعت درج نہیں، مولانا حسرت موہانی کی شرح کے دوسرے اڈیشن مطبوعہ ۱۹۱۰ء کے دیباچہ میں اس کا ذکر ہے، جس سے ظاہر ہے کہ طباطبائی کی شرح ۱۹۱۰ء سے پہلے لکھی جا چکی تھی، حسرت موہانی نے اپنے دیباچہ میں لکھا کہ یہ شرح سب شرحوں سے بہتر ہے، اور حقیقت ہے کہ غالب کا کلام یادگار غالب کے بعد زیادہ تر اسی شرح سے سمجھا گیا، اسکو یادگار غالب پر اس لحاظ سے فوقیت ہے کہ یادگار غالب میں تھوڑے سے اشعار کی شرح ہے اور اس میں ہر شعر کی ہے، طباطبائی لکھنؤ کے رہنے والے تھے، لیکن نظام کالج حیدرآباد میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، غالب کے کلام کے رموز و نکات دکھانے کے بعد انھوں نے بڑا استادانہ اور ماہرانہ انداز اختیار کیا ہے، اس کے لکھے ہوئے ساٹھ سال سے زیادہ ہوگئے، لیکن آج بھی غالب کے اشعار کی مشکلوں کو حل کرنے میں یہ ناگزیر ہے، ان کو غالب کے جو اشعار بہت زیادہ پسند آئے، ان کی داد دل کھول کر دی، اور جن میں ان کو محاسن کے بجائے معائب نظر آئے، ان پر اپنی خراب رائے کا اظہار کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا ہے۔

(باقی)

بریلی میں غالب کے تلامذہ

(ایک تذکرہ)

از

جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے آس پاس کے زمانے میں بریلی کی شاعری خاص طور پر دو خاندانوں سے وابستہ تھی، ایک خاندان نوابین روہیلہ کا تھا جو موجودہ انگلش گنج اور گلی نوابان میں آباد تھے، دوسرا خاندان مفتیان کا تھا جو محلہ ذخیرہ پل قاضی، گلی مفتیان اور فرشوری محلے میں آباد تھے، خاندان نوابین روہیلہ کے محتشم شعرا ابتداءً اساتذۂ بریلی کے شاگرد ہوئے، مگر سن شعور کو پہنچنے کے بعد انھوں نے میر مظفر علی اسیر (۱۸۰۰ء تا ۱۸۸۱ء) کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا، مثلاً نواب نیاز احمد خاں ہوش جو ابتداءً امیر الدین آزاد اور محسن علی خاں جوش کے شاگرد ہوئے، مگر بعد کو اسیر لکھنوی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے، نوابین روہیلہ کے دواوین کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ اساتذۂ دہلی کے مقابلے میں اساتذۂ لکھنؤ سے زیادہ متاثر تھے، اور ان کے کلام میں لکھنوی طرز شاعری کے اثرات ملتے ہیں، خاندان مفتیان کے شعرا نے اساتذۂ لکھنؤ کے اثرات کو بالکل قبول نہیں کیا، اس خاندان کے محتشم شعرا غالب کے شاگرد ہوئے، ان کی اولاد نے غالب سے نسبتِ شاعری پر فخر کیا، اور وہ آج تک اساتذۂ دہلی کو نمونۂ شعر و شاعری سمجھتے ہیں، دونوں خاندانوں میں اردو شاعری کے دو مرکزوں سے وابستگی کے اسباب جو کچھ بھی رہے ہوں مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اس سے بریلی میں شعر و شاعری کو فروغ ہوا، گذشتہ صدی کی آخری دہائیوں

میں جب اقلیم شاعری میں داغ کا پرچم بلند ہوا اور بریلی کے شاعروں کی کثیر تعداد نے ان کی غزلگوئی کا اتباع کیا، اُس وقت بھی خاندانِ مفتیان کے بیشتر شعراء اپنے محاذ پر جمے رہے، مفتی عماد الحسن محوؔ (۱۸۶۳ء تا ۱۹۲۹ء) تلمیذ غلام بسمل اللہ بسملؔ ابن مفتی سلطان حسن خاں احسنؔ تلمیذ غالبؔ نے لکھا تھا۔

ہیں مختلف انداز کے نغموں کی صدائیں	رنگینیٔ بزمِ شعرا دیکھ رہے ہیں

مگر انھوں نے اس رنگینیٔ بزم شعراء کے ماحول میں اپنے سلسلۂ غالب کو فراموش نہیں کیا، فرماتے ہیں:

پہنچ جائیگا اپنا سلسلہ اے محوؔ غالبؔ تک	جو شاگردی کی نسبت حضرت بسملؔ سے نکلے گی
ہو فرد محوؔ حضرتِ غالبؔ کے فیض سے	دعویٰ ہو جس کو لکھے غزل وہ جواب میں
جدا ہے طرز میری سب سے ہو بری کہ بھلی	جناب غالبؔ و بسملؔ کی یادگاروں میں

غالبؔ سے اس گہری وابستگی کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ بریلی میں غالبؔ کے چھ تلامذہ میں سے چار کا تعلق خاندانِ مفتیان سے تھا۔

احسنؔ، مفتی سلطان حسن خاں (۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۲ء): آپ کے بزرگوں کا تعلق بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان سے تھا، آپکے مورث اعلیٰ قاضی دانیال قطر نواح مصر سے ترک سکونت کرکے ہندستان وارد ہوئے تھے، اکمل التاریخ میں مرقوم ہے:

"قاضی دانیال قطری نواح قطر سے ترک سکونت کرکے جیش اسلامی کے ہمراہ ہندستان وارد ہوکر اول لاہور میں مقیم ہوئے تھے، اسکے بعد مقام دیوبند میں مقیم رہ کر ایک عالم کو مستفیض کرکر شہرت کامل حاصل کر چکے تھے، سلطان [سلطان التمش۔ دور حکومت ۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء] کی اشتیاق آفریں طلب کی بدولت ہاتھوں ہاتھ بدایوں بلائے گئے، عزت و تکریم سے خیر مقدم کرکے عظمت و وقار کی مسند پر بٹھایا۔ عہدۂ قضا حکومت کیجانب سے پیش کیا گیا، اس وقت آپ دائرۂ حکومت شمسی کے قاضی القضاۃ مشہور ہوئے۔" (ص ۳۱)

آپ کی تعلیم و تربیت، علم و فضل اور ثروت و عظمت کے متعلق اکمل التاریخ میں مرقوم ہے:-

"آپ مولوی احمد حسن خاں صاحب صدر الصدور (جن کا انتقال شعبان ۱۲۷۳ھ [مطابق ۱۸۵۷ء] میں ہوا) کے بیٹے اور مفتی ابو الحسن صاحب کے پوتے ہیں، آپ بریلی کے منتخب عمائد و امراء کے طبقے میں تھے، جملہ علوم و فنون میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، استاذ مطلق مولانا فضل حق خیر آبادی کے مشہور تلامذہ میں تھے، جلیل القدر عہدوں پر مامور رہے، صدر الصدوری سے پنشن پائی، مفتی سعد اللہ صاحب مراد آبادی اور آپ سے علمی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی، چنانچہ دونوں صاحبوں کا ایک زبردست مکالمہ رسالہ کی صورت میں چھپا ہے، مولوی اعتماد الحسن صاحب مولوی قطب الحسن صاحب وغیرہ پانچ صاحبزادے آپکے بریلی میں موجود ہیں، مولوی بشیر الدین صاحب قنوجی غیر مقلد بھی آپکے شاگرد تھے۔" (ص ۴۲)

آپکے پوتے جناب مفتی صابر حسن شیوا عثمانی (۲/۷۷۵ ادارالبرکات لیاقت آباد کراچی ۱۹) نے اپنے مکتوب گرامی مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۶۷ء میں راقم الحروف کو تحریر کیا:-

"آخر زمانۂ ملازمت آگرہ میں گزرا، وہیں مرض موت میں مبتلا ہوکر وطن آنے کے لیے رخصت لی [اس بیان کی روشنی میں اکمل التاریخ کی یہ تحریر "صدر الصدوری سے پنشن پائی" صحیح نہیں ہے۔ یوں بھی انتقال کے وقت انکی عمر ۵۲ سال کی تھی] اور اثنائے سفر حضرت باقی باللہ علیہ الرحمہ نے خواب میں دہلی آنے کا حکم دیا، چنانچہ بجائے وطن آنے کے دہلی کا رخ کیا۔ اور بقول میرے والد (مفتی عماد الحسن محوؔ) باون ۵۲ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور خواجہ صاحب کے جوار میں دائمی سکونت اختیار فرمائی۔ حضرت حافظ غلام رسول ویرانؔ نے آپ کی تاریخ وفات نکالی جو میں نے ۱۹۲۰ء میں خود ان کے مزار پر کندہ دیکھی تھی۔ اگرچہ امتداد زمانہ نے قبر کو شکستہ کر دیا تھا اور کتبہ میں روشنائی باقی نہیں رہی تھی، قطعۂ تاریخ

مولوی سلطان حسن خاں عالم نیکو عمل	چوں سفر کرد از دنیا سوئے دار النعیم
بہر سال رحلت ایشاں بگوش دل رسید	ایں ندا از عالم بالا "لہم اجر عظیم"

۱۲۹۹ھ (مطابق ۱۸۸۲ء)

مفتی اعتماد الحسن محوؔ کے شاگرد جناب صدیق احمد سالک بلند شہری یادگار محوؔ میں رقمطراز ہیں:-

"مولانا مفتی حکیم حاجی سلطان حسن خاں صاحب احسنؔ بعد ایام غدر مدتوں صدر الصدوری کے اہم فرائض انجام دیتے رہے اور بحالت ملازمت جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوکر بغرض معالجہ دہلی تشریف لے گئے، تو سرکار

نظام دکن خلد اللہ ملکہ کے یہاں بشاہرہ یک ہزار ماہوار طلب فرمائے گئے، لیکن وقت برابر آچکا تھا۔ (ص۱)

ان اقتباسات سے مفتی سلطان حسن خاں احسن کے متعلق ضروری معلومات فراہم ہو جاتی ہیں، اور ابتک ان کے حالات کے سلسلے میں جو تشنگی تھی وہ دور ہو جاتی ہے۔

مجھے آپ کے نام غالب کا کوئی خط دستیاب نہیں ہوا، اس سلسلے میں آپکے پوتے مفتی صادق حسن صادق (بن مفتی عماد الحسن محو) نے بتایا کہ شعر و شاعری کے لیے جملہ خط و کتابت دادا جان کی طرف سے ناظر جی [غلام بسم اللہ بسمل] کیا کرتے تھے، جو مدت العمران کے ساتھ رہے، اس بیان کی صداقت کا ثبوت غالب کا وہ مکتوب ہے جو انھوں نے غلام بسم اللہ بسمل کو تحریر کیا تھا، جس میں انھوں نے مفتی سلطان حسن خاں احسن کی غزل میں اصلاح کم ہونے کی اطلاع دی تھی، ساتھ ہی ساتھ بسمل کو خط میں تداخل سے باز رکھنے کے لیے فہمائش کی تھی، کیونکہ (ایسا معلوم ہوتا ہے) بسمل اور مفتی احسن کی غزلیات اور مکاتیب ان کو ایک لفافے میں ہی موصول ہوئے تھے۔ غالب کے مکتوب کا اقتباس یہ ہے

"آپ کے منصف صاحب کی بھی غزل میں اصلاح کم ہوئی ہے، الخ

"یعنے حضرت خط میں تداخل ہوا ہے، اگر یہاں کی ڈاک میں کبھی خط کھل گیا تو مجھ سے پچاس روپیہ لیے جاوینگے باقی کا حکم ہوگا، آئندہ آپ خط جداگانہ بھیجا کیجئے۔ اس باب میں تاکید جانیے، کوئی حیلہ جواز کا آپ کی طرف سے مسموع نہ ہوگا۔ غالب" (عود ہندی۔ ص ۲۶۱)

باینہمہ اگر غالب کے مکاتیب مفتی سلطان حسن خاں احسن کے نام آئے بھی (جو میرے خیال میں ضرور آئے ہوں گے، کیونکہ مرزا بد خلق نہ تھے اور خطوط کا جواب دینے میں عار نہیں کرتے تھے) تو وہ اب ان کے خاندان میں محفوظ نہیں ہیں، میں نے انکی تلاش غلام بسم اللہ بسمل کے یہاں بھی کی، مگر غالب سے متعلق کوئی چیز نہیں ملی، بسمل کا کتب خانہ، نوادرات اور اہم کاغذات انکی زندگی ہی میں آتشزدگی سے ضائع ہو گئے تھے۔

خطوط غالب کی طرح مفتی سلطان حسن خاں احسن کا کلام بھی دستیاب نہیں ہوا، مفتی صاحب حسن شیوا عثمانی

نے ایک شعر غزل کا اور دو اشعار نعت کے عنایت کیے جو حسب ذیل ہیں:-

بت ہی پتھر کا کیوں نہو احسن　　اچھی صورت پہ پیار آتا ہے

تمہارے فضل میں سب سے مرا یہ حق فائق ہو　　نہیں امت میں بدکردار مجھ سا یا رسول اللہ
مدینہ کی گدائی ہو کہیں سلطان کو حاصل　　ملے بہر حسن اس کو یہ حصہ یا رسول اللہ

مفتی صاحب نے فرمایا کہ یہ نعتیہ اشعار ایک قصیدے سے لیے گئے ہیں جو مفتی سلطان حسن خاں احسن نے حج بیت اللہ شریف کے موقع پر لکھا تھا، انکے یہ اشعار کسی کتاب میں نہیں ملتے، لہذا یہ تین شعر بھی غیر اہم نہیں ہیں،

بسمل، غلام بسم اللہ
۱۸۲۳ء تا ۱۸۹۵ء

غلام بسم اللہ تاریخی نام تھا، (۱۲۳۹ھ) جس سے مشہور ہوئے، اصل نام شاکر علی تھا، جس سے انکے اہل خاندان بھی ناواقف ہیں، والد کا نام سرفراز علی تھا جو مغلیہ دور کے ایک امیر نواب خیر اندیش خاں کی اولاد سے تھے، سرفراز علی کا وطن بریلی تھا، وہ کمسریٹ میں سررشتہ دار اور رقوم کے کبوہ تھے، بسمل کی پیدائش میرٹھ میں ہوئی اور تعلیم و تربیت مارہرہ اور بریلی میں، ناظر عدالت تھے، مفتی سلطان حسن خاں احسن جب منصف ہوئے تو بسمل انکے ناظر رہے، مفتی صاحب کے خاندان میں انکو آجتک ناظر جی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، سلسلۂ طریقت میں حضرت شاہ عبدالرحمٰن سے بیعت تھے، دو مرتبہ حج بھی کیا، ملازمت سے پنشن لینے کے بعد بریلی ہی میں سکونت اختیار کی، مفتی سلطان حسن خاں احسن کے خاندان میں انکی بہت منزلت تھی، مفتی صاحب کے صاحبزادے مفتی عماد الحسن محو انکا بیحد احترام کرتے تھے، صدیق احمد سالک بلند شہری نے یادگار محو میں لکھا ہے:-

"جو آپکے [مفتی عماد الحسن محو] والد ماجد [مفتی سلطان حسن خاں احسن] اور حضرت بسمل سے نہایت ہی خلوص کے برتاؤ تھے اور تاحیات انکے ہمراہ رہے، ایک ہی ساتھ حضرت غالب کی شاگردی سے ممتاز ہوئے اسلیے حضرت محو سے مثل اپنی اولاد کے عمر بھر محبت و شفقت فرماتے تھے، حضرت محو نے بارہا فرمایا کہ آنجناب میرے استاد ہی نہ تھے، بلکہ میں ان کو اپنا پیر بھی سمجھتا ہوں۔" (ص ۲)

بسمل کے پوتے جناب عبدالقادر (بن عبدالرحمٰن کامل) حیات ہیں، اور اپنے آبائی مکان (تلہ نزد جامع مسجد) میں رہتے ہیں، بسمل کے دیگر افراد خاندان بھی جامع مسجد کے قریب رہتے ہیں، انکے پاس بسمل کی کوئی ادبی یادگار نہیں ہے، بسمل کا ایک قصیدہ، جو انھوں نے سلطان عبدالحمید خان کی شان میں لکھا تھا، انکے پاس محفوظ تھا، مگر چودہ پندرہ سال قبل وہ بھی کسی ایسے اجنبی کو دیدیا تھا کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ اجنبی کا نام اور پتہ کیا ہے۔

بسمل کے نام غالب کے مکتوب کا ذکر گذشتہ سطور میں ہوچکا ہے، اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کلام میں اصلاح کی کمی کو وہ اور مفتی احسن صاحب استاد کی سہل انگاری سے تعبیر کرتے تھے، غالب نے مذکورہ مکتوب میں لکھا ہے:

"صاحب یہ نیا ڈھنگ شکایت کا ہے، اگر تمھارے کلام میں اصلاح کم ہو تو وہ کلام کی خوبی ہے اس کو استاد کی سہل انگاری کیوں سمجھو۔ الخ (عود ہندی ص ۲۶۱)

بسمل کا سرمایۂ شاعری تلف ہوچکا، دیوان غزلیات طبع نہیں ہوا تھا، جو کلام محفوظ تھا وہ بھی آگ کی نذر ہوگیا، کچھ اشعار تذکروں میں مل جاتے ہیں، ایک غزل مندرجۂ ذیل ہے ؎

شب وفور اشک سے گردوں کف سیلاب تھا ... دورۂ چشم کواکب حلقۂ گرداب تھا

واں حنا بندی عناں گیر خرام ناز تھی ... یاں تن کاہیدہ غرق اشک خوں ناب تھا

واں رخ پُر نور تھا صبح امید زندگی ... یاں ہر اک داغ جگر خورشید عالمتاب تھا

حسن تمکیں آزماں کو پاس خودداری ادھر ... خانہ زاد عشق کو ملحوظ یاں آداب تھا

ان کو پاس ننگ دامن گیر مجھ کو پاس وضع ... وہ اُدھر بیتاب تھے اور میں ادھر بیتاب تھا

میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر ... بستر سنجاب تھا نے بالش کمخواب تھا

بسمل نے اس غزل میں غالب کی تقلید کی ہے، انکا کلام نہیں ملتا، اسلیے صرف اس غزل سے یہ رائے قائم کرنا دشوار ہے کہ انھیں غالب کی تقلید کا شوق تھا، اور انکی طرحوں میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے، مجھے بسمل کی ایک غزل بریلی کے ایک پرانے گلدستہ میں ملی تھی، جو مندرجۂ ذیل ہے۔

کھینچ کر تیغ جو میدان میں ستمگر آیا ... سر بکف میں صف عشاق سے باہر آیا

حلقۂ زلف نے گھیرا جو چھٹے عشق سے ہم ... پاؤں زنجیر سے نکلا تھا کہ چکر آیا

جی کو تڑپاتا ہے یہ نقش پہ کہنا ان کا ... جان کیوں مفت میں دی کیا تڑپ دلبر آیا

وحسینان جہاں ہم سے جدا ہوتے ہیں ... آہ اے ہم نفساں وعدۂ بد آیا

حالت نزع میں لکھا کہ مسیحا میرے ... جیتے جی ہند میں لندن سے تو کیونکر آیا

لکھا آتا ہوں اگن بوٹ پہ بجلی کی طرح ... تار برقی پہ جواب دل مضطر آیا

جو کہ ڈر جائے مر اس کے تخلص بسمل ... وہ شہیدی کے جنازہ پہ مقرر آیا (کذا)

اس غزل میں نہ غالب کا تقلیدی رنگ ہے اور نہ کوئی دلکشی۔

بسمل کے دو اشعار مفتی صابر حسن شیوا عثمانی نے فراہم کیے ہیں ؎

زاہد خشک جا کے مسجد میں ... بوجھ سر کا اتار آتا ہے

دیکھ کر مجھکو بولے بسم اللہ ... بسمل دلفگار آتا ہے

اس زمین میں مفتی سلطان حسن خاں احسن کا بھی شعر تھا، جو ان کے بیان میں پیش کیا جاچکا ہے

بسمل نعت گو بھی تھے، انکی نعتوں کا ۳۲ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مجموعہ مسمی نالۂ بسمل چھپا تھا، مگر اب وہ نایاب ہے۔

بسمل کی وفات ۱۸۹۸ء میں ہوئی، مفتی عماد الحسن محو نے " ان العاقبۃ للمتقین" (۱۳۱۵ھ) سے تاریخ وفات نکالی، ان کی قبر ان کے آبائی قبرستان میں محفوظ ہے۔

جنون۔ قاضی عبدالجمیل
۱۸۳۵ء تا ۱۹۰۱ء

غالب کے بریلوی تلامذہ میں قاضی عبدالجمیل جنون سب سے زیادہ مشہور ہوئے، اسکا سبب وہ خطوط ہیں جو انکو مرزا صاحب نے لکھے تھے، البتہ انکا کلام ضائع ہوگیا، جو تذکروں کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔

قاضی عبدالجمیل جنون اور مفتی سلطان حسن خاں احسن کا خاندانی سلسلہ مفتی درویش محمد صاحب سے مل جاتا ہے، اس طرح دونوں بزرگ یک جدی تھے، قاضی عبدالجمیل جنون کے متعلق اکمل التاریخ میں مرقوم ہے :-

---

۵۱ گلدستہ لطیف بریلی جولائی ۱۸۸۱ء

"قاضی غلام نبی صاحب [بن مفتی محمد امجد صاحب بن مفتی درویش محمد صاحب] بریلی کے قاضی تھے، آصف الدولہ کے دربار میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، گورنمنٹ انگلشیہ میں بھی بہت کچھ وقار تھا اور خلعت وغیرہ سے سرفراز ہوتے رہتے تھے، ۱۶؍ دسمبر ۱۸۱۳ء کو انتقال ہوا، ان کے بیٹے قاضی غلام احمد صاحب بھی نہایت باوقعت شخص تھے، حافظ بھی تھے، انتقال بروز عید الفطر ۳؍ اگست ۱۸۳۶ء کو ہوا، عیدگاہ میں انکے بڑے بیٹے قاضی عبد الجلیل صاحب نے اول انکی نماز جنازہ پڑھائی، اس کے بعد دوگانہ عید الفطر ادا کیا، یہ بھی گورنمنٹ کے خصوصی انعامات سے ہمیشہ سرفراز ہوتے رہے۔ ۱۰؍ رمضان المبارک ۱۲۸۱ھ [۴ دسمبر ۱۸۶۴ء] کو انتقال ہوا، انکے بیٹے خان بہادر عبد الجمیل صاحب تھے، تحصیل علم مفتی عنایت احمد صاحب سے کی اور شاعری میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے، علاوہ قضاۃ قدیمی خاندان کے گورنمنٹ کی طرف سے قاضی شہر بھی مقرر ہوئے۔ ۳۰؍ مئی ۱۹۰۰ء کو رحلت کی۔" (ص ۴۵ و ۴۶)

ان کے متعلق مرزا محمد عسکری لکھتے ہیں:۔

"قاضی صاحب موصوف ۱۲۵۱ھ [۱۸۳۵ء] میں بمقام بریلی پیدا ہوئے اور اٹھارہ برس کی عمر میں تحصیل علوم عربی اور فارسی سے فراغت حاصل کی، اسی زمانے میں شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور مشق کرنے لگے، جب ذرا مشق پختہ ہو چلی تو مرزا صاحب کو اصلاح کلام کے لیے تجویز کرکے ۱۲۶۹ھ [۱۸۵۲ء، ۱۸۵۳ء] میں دو ایک غزلیں بھیجیں، مرزا کو ضعف پیری اور آلام نے گھیر رکھا تھا، پریشان تھے، دوسرے جب تک کسی کو اچھی طرح جانچ نہ لیتے تھے اس سے بے تکلف نہ ہوتے تھے، غرض انہی وجوہ سے آئی ہوئی غزلیں یہ لکھکر واپس کر دیں کہ میں نے نہ تو آپ کی غزلوں میں کچھ عیب پایا کہ ان پر اصلاح کرتا اور نہ اس اصلاح سے کچھ فائدہ ہے جب تک کہ استاد کی صحبت میں نہ رہا ہو اور مدتوں تک اسکی روش کو پیش نظر رکھے، اس وقت تک کام نہیں چل سکتا مبدأ فیاض سے ہمت طلب کیجئے اور مشق کیے جائیے، آپ کی لیاقت اور قابلیت رہبری کرے گی اور اصلاح کی ضرورت نہ رہے گی، مگر قاضی صاحب نے اس تحریر کو صرف ایک دفع الوقتی خیال کیا اور متعدد خطوط بھیجے، مرزا بد خلق تو تھے نہیں ٹالنا چاہتے تھے، مجبوراً اصلاح دینا شروع کر دی اور رفتہ رفتہ زیادہ مہربان ہو گئے۔"

(ادبی خطوط غالب۔ ص ۲۴۹-۲۵۰)

مالک رام صاحب نے تحریر کیا ہے:۔

"غالب کی کتاب دستنبو کا دوسرا اڈیشن انہی کی نگرانی میں بریلی میں شائع ہوا تھا۔" (تلامذۂ غالب)

مکاتیب غالب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ہی قاضی صاحب سے بڑی خصوصیت تھی، چنانچہ پیرانہ سالی اور آلام روزگار کے باوجود قاضی صاحب کے خطوط کا جواب پابندی سے دیا کرتے تھے، قاضی صاحب بھی انھیں خطوط لکھکر انکے حالات دریافت کرتے رہتے تھے، مثلاً مرزا صاحب نے قاضی صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا ہے:۔

"حیران ہوں کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں، روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں، کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع پسند نہیں، کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت، یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقعہ ہے۔ مصرعہ

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم" (عود ہندی ص ۲۳۵)

قاضی صاحب کی پرسش دوستانہ کے جواب میں مرزا صاحب ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:۔

میں نہ تندرست ہوں، نہ رنجور ہوں، زندہ بدستور ہوں، دیکھئے کب بلاتے ہیں اور جبتک جیتا رہوں گا کیا دکھاتے ہیں (عود ہندی ص ۲۳۶)

مرزا صاحب نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کی تہنیت کے لیے جب رامپور آئے تھے (۱۲؍ اکتوبر ۱۸۶۵ء) تو قاضی صاحب نے انھیں بریلی آنے اور نمائش گاہ کے سیر کرنے کی دعوت دی تھی، مرزا صاحب نے اس خط کے جواب میں تحریر کیا ہے:

نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں۔ خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جسکو دنیا کہتے ہیں، دل بھر گیا، اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔" (عود ہندی ص ۲۳۶)

قاضی صاحب نے ایک خط کے حاشیہ اور پشت پر اشعار لکھے، وہ بھی پھیکی سیاہی سے اور انھیں مرزا صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح بھیجا، مرزا صاحب کو اشعار کے پڑھنے میں دقت ہوئی، مگر قاضی صاحب کی دلدہی منظور تھی، فرماتے ہیں:

"میں عینک کا محتاج نہیں لیکن باینہمہ اسکے پڑھنے میں بہت تکلیف کرنی پڑتی ہے، علاوہ اسکے جگہ اصلاح کی باقی نہیں، چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں واپس بھیجتا ہوں تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا ہوگا، لہذا میرا اندیشہ آپ کو بھی ہو جائے، آپ خود دیکھ لیں کہ اس میں اصلاح کہاں دیجائے، واسطے اصلاح کے

جو غزل بھیجئے، اس میں بین الافراد و بین مصرعہا فاصلہ زیادہ چھوڑیے۔" (عود ہندی، ص ۲۲۹)

قاضی صاحب سے مرزا غالب کا پتہ لکھنے میں تسامح ہوا تھا، وہ لال کنواں کا پتہ لکھتے رہے اور مرزا اپریل ۱۸۵۲ء میں بلی ماران میں منتقل ہو گئے تھے، اسکے باوجود قاضی صاحب کے مکاتیب انکو ملتے رہے، لال کنواں میں مرزا صاحب مولانا نصیر الدین عرف کالے صاحب کی حویلی میں رہتے تھے، قاضی صاحب نے اپنے مکتوب میں، کالے صاحب کے خیال میں، حکیم کالے خاں لکھدیا، اس کے ساتھ ہی خط نہ بھیجنے کے تردد کا اظہار بھی کر دیا، گویا محلہ غلط، معرفت غلط، اس پر اظہار تردد، اسکے باوجود مرزا کو مکاتیب ملتے رہے، مگر ان میں ضروری بات نہیں تھی، اسلیے جواب نہیں دیا، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"قبلہ آپ کو خط کے بھیجنے میں تردد کیوں ہوتا ہے، ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں، گاہ گاہ انگریزی بھی، اور ڈاک کے ہرکارے بھی میرا گھر جانتے ہیں، پوسٹ ماسٹر بھی میرا آشنا ہے، مجھکو جو دوست خط بھیجتا ہے وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے، محلہ بھی ضرور نہیں، آپ ہی انصاف کریں کہ آپ لال کنواں لکھتے ہے اور مجھکو بلی ماران میں پہنچتا رہا، یہ اب کی آپنے حکیم کالے خاں نام کیا لکھا ہے، اس غریب کو تو شہر میں کوئی جانتا بھی نہیں، خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہوا، جو آپنے بھیجا وہ مجھکو پہنچا، بات یہ ہو کہ شوقیہ خطوں کا جواب کہاں تک لکھوں، میں نے آئین نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے، جب مطلب ضروری التحریر ہو تو کیوں نہ لکھوں" (عود ہندی، ص ۲۲۸-۲۲۹)

قاضی صاحب کی غزلوں میں کوئی سقم نہیں تھا، اسلیے مرزا صاحب نے غزلیات واپس کرتے ہوئے لکھا کہ ان غزلوں میں کہیں اصلاح کی جگہ نہیں، مرزا صاحب کو یہ اندیشہ تھا کہ قاضی صاحب یہ نہ سمجھ لیں کہ غزلیں بغیر اصلاح کے واپس کر دیں جو کہ آزردگی طبع کا باعث ہو،

"آداب بجا لاتا ہوں۔ آپ کا نوازش نامہ پہنچا، غزلیں دیکھی گئیں، فقیر کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کلام میں اسقاط و اغلاط دیکھتا ہوں تو رفع کر دیتا ہوں اور اگر سقم سے خالی پاتا ہوں تو تصرف نہیں کرتا، بس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان غزلوں میں کہیں اصلاح کی جگہ نہیں۔" (عود ہندی، ص ۲۳۰-۲۳۱)

مرزا غالب آموں کے رسیا تھے، قاضی صاحب نے جب انکی خدمت میں دو ٹوکرے آموں کے بھیجے تو انھوں نے دعاؤں کے ساتھ لکھا:۔

"سبحان اللہ سر آغاز فصل ایسے ثمرہائے بیش اس کا بھیجنا تو یہ ہزار گونہ میمنت اور شادمانی ہے، یہ ثمر طیب انواع اثمار ہے۔ اسکی توصیف کیا کروں۔ کلام اس بات میں کیا چاہتا ہوں کہ میں یاد رہا اور ابدا کا آپ کو خیال آیا، پروردگار باہمہ رواں پروری و کرم گستری دیا داوری سلامت رکھے۔" (عود ہندی ص ۲۳۲)

ایک خط میں قاضی صاحب سے دیر سے خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہیں،

"حضرت بہت دنوں میں آپ نے مجھکو یاد کیا۔" (ایضاً ص ۲۳۳)

مختصر یہ کہ مرزا غالب اور قاضی عبد الجمیل جنون کے درمیان باہمی محبت، خلوص اور احترام کا تعلق تھا، قاضی صاحب انکی صحت و عافیت دریافت کرتے رہے، ان کو تحائف بھیجتے، انکو بریلی آنے کی دعوت دیتے۔ مرزا صاحب اپنے شاگرد کی دلجوئی کا خیال رکھتے اور انکی فرمائشیں بھی پوری کرتے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب نے نظم و نثر کی کتابوں کی فرمائش کی اور ایک غزل کی نقل مانگی، مرزا صاحب نے جواب میں لکھا:

"شہر بہت غارت زدہ ہے، نہ اشخاص باقی نہ اماکن، کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا کہ اگر میری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ آ جائیگا تو وہ مول لیکر خدمت میں بھیجدیا جائیگا۔ مصرعہ: دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت + ایک دوست کے پاس بقیۃ النہب والغارت میرا کچھ کلام موجود ہے اس سے یہ غزل لکھوا کر بھیجدی گئی۔" (عود ہندی ص ۲۳۴)

مرزا صاحب کبھی قاضی صاحب کو کسی ادبی نکتے کی بابت تحریر فرماتے:

"دو باتیں سنیے طرح بسکون راے قرشت بمعنی قریب ہے لیکن اردو میں یہ لفظ مستعمل نہیں، وہ دوسرا لفظ ہے۔ طرح بحرکت راے قرشت بر وزن فرح اس کو بسکون رے مہملہ بولنا عوام کا منطق ہے، اس غزل طرح کی زمین طرح کی یہ بسکون اور یعنی روش و طرز و طرح ہے۔ بفتحتین"

اس خط میں غالب نے مولوی احمد حسن کو سلام لکھا ہے (المتوفی ۱۸۵۶ء) مفتی محمد حسن خاں امیر صدر الصدور مراد آباد کے بڑے بھائی اور مفتی سلطان حسن خاں احسن کے والد بزرگوار تھے۔

مذکورہ بالا خط پڑھنے کے بعد قاضی صاحب نے غیاث اللغات کے حوالے سے لکھا کہ طرح کے معنی نمونہ اور قریب

کے بھی ہیں۔ غالب نے جواب میں تحریر کیا:

"طرح بالفتح بمعنی نمونہ اور بمعنی قریب سچ لیکن طرح بفتحتین اور چیز ہے، غیاث الدین رامپور میں ایک ملائے مکتبی تھا، ناقل نا عاقل جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا، اس کا فن لغت میں کیا فرجام ہوگا"۔

مرزا غالب ہندی نژاد فارسی گویوں کو مستند نہیں سمجھتے تھے، اسی بنیاد پر کلکتہ میں (۱۸۳۰ء) مرزا صاحب اور محمد حسن قتیل کے درمیان چشمک پیدا ہوگئی، مرزا صاحب تمام عمر اپنی رائے پر قائم اور اپنی تحریر کے ذریعہ قتیل پر طنز کرتے رہے۔

غالب سوختہ جاں راچہ بہ گفتار آری
بہ دیارے کہ ندانند نظیری ز قتیل

اس خط میں بھی انھوں نے غیاث الدین کے ساتھ مرزا قتیل کو بھی شامل کرلیا اور طنزاً "لالہ" قتیل بھی لکھا۔ غالب کی یہ انتہا پسندی انکی پیرانہ سالی میں ذہنی کرب کا سبب بنی، کیونکہ جب انھوں نے محمد حسین برہان دکنی کی فارسی لغت برہان قاطع (۱۶۵۱ء) پر اعتراضات کیے تو ان کے خلاف طوفان کھڑا ہوگیا، اور بحث علمی سطح سے اتر کر ذاتی اور شخصی رکیک حملوں تک آگئی، مرزا نے تیغ تیز میں اعتراف کیا ہے۔

"امین الدین قاطع القاطع کے مصنف نے وہ مغلظ گالیاں دی ہیں جو کنجڑے اور بھٹیارے استعمال کرتے ہیں، یارب میاں امین الدین کس بری قوم کے اور پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے، مدرس بنے، گر الفاظ مستعملہ قوم بھولے"۔

آخر میں مرزا کی طرف سے امین الدین کے خلاف ازالۂ حیثیت کے مقدمہ تک نوبت پہنچی (۱۸۶۸ء)

غیاث الدین نے طرح کے معنی بیان کرنے میں لطائف اللغات، منتخب اللغات اور چراغ ہدایت کا حوالہ دیا تھا، انھوں نے یہ التزام پورے لغت میں کیا ہے، اور جن لغات سے استفادہ کیا تھا انکی تفصیل مقدمہ میں دیدی تھی، اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ انھوں نے غیاث اللغات کی تالیف اس خیال سے کی ہے کہ درسی کتب کی تدریس میں آسانی پیدا ہو اور اس زمانے کی درسی کتب کی تفصیل بھی پیش کردی تھی، اور لغت کی ترتیب میں جو اصول پیش نظر رکھے تھے، مقدمے میں ان کا بھی اظہار کر دیا تھا، اور اس پر مشقت کام میں جو کوتاہیاں رہ گئی ہوں ان پر معذرت اور اہل علم و تمیز سے ان پر زبان ملامت نہ کھولنے کی درخواست کی تھی، مرزا غالب کے پیش نظر یہ امور نہیں رہے، انھوں نے

لغت پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی، لغت نویس کو دیکھا جو انھیں ملائے مکتبی نظر آیا، اور انکے علم و تمیز میں ناقل نا عاقل ٹھہرا جس کی لغت کا ماخذ ایک درجن سے زائد مستند و معروف لغات نہیں بلکہ مرزا قتیل کا کلام تھا، قاطع برہان کی تالیف میں بھی یہی ذہنیت کارفرما تھی، اور مرزا قتیل سے مبارزت طلبی کا سبب بھی یہی انداز فکر تھا، اگر امین الدین نے مرزا کے خلاف طنز و ہزل سے دریغ نہیں کیا تو یہ بھی اہل علم کے منصب کے منافی تھا، لیکن مرزا کو خطا سے بالاتر، صرف ان ہی کو محقق سمجھنا اور انکی خطاؤں سے درگزر کرنا، اہل تحقیق کی خطا ہے، اس سے مرزا کی عظمت میں اضافہ نہیں ہوتا جس طرح امین الدین کی ہرزہ سرائی سے انکی عظمت میں کمی نہیں ہوتی۔

قاضی عبدالجمیل جنون کا کلام نہیں ملتا۔ ان کے خاندان میں اب غالب کے سلسلے کی کوئی چیز محفوظ نہیں ہے، جو تھوڑا بہت سرمایہ محفوظ تھا وہ مولوی مہیش پرشاد لیگئے تھے جنون کے اشعار صرف تذکروں میں ملتے ہیں، ان میں غزل کا پورا لطف ہے:

انھوں نے آئینہ دیکھا تو میں نے منہ ان کا
حواس و ہوش بجا واں تو یاں بھی نہیں

نہ سہی لطف و عنایت ستم و جور سہی
غم تو یہ ہے کہ نہیں حال کا پرساں کوئی

گرم کیوں ہوتے ہو اغیار کے آگے مجھ پر
آگ میں ڈالیے پر یوں نہ جلایا کیجے

تاب طاقت نے دیا فرقت جاناں میں جواب
بار غم ناز نہیں ہے کہ اٹھایا کیجے

گالیاں کھا کے رہوں چپ یہی بات اچھی ہے
کہ بگڑتا ہوں تو وہ اور بناتا ہے مجھے

آیا نہ ان کو تفرقۂ جان و دل پسند
دل لے چکے تھے جان بھی اب آکے لیجیے

بیمار عشق کو نہ لگا ہاتھ اے طبیب
کچھ درد سر نہیں ہے کہ اچھا دوا سے ہو

جو حسین ہم کو ملا کافر بے دیں ہی ملا
جس کو دیکھا اسے غارت گر ایماں دیکھا

نہ ہوا خندۂ بے وجہ گوارا گل کو
ہم نہ کہتے تھے نہ کر سیر گلستاں دیکھا

کہاں یہ تاب کہ آنکھیں ملا سکوں تجھ سے
کہ اک نگہ میں دگرگوں ہے حال محفل کا

ہیں جو رخصت ہو کے اس سے پھر گیا تو یہ کہا
کیوں گئے کیوں آئے کیا بھولے تھے کیا یاد آگیا

سامنے یوں نکل جاتے ہیں وہ
ان سے گویا کچھ شناسائی نہیں

کچھ آیا راہ پر شاید وہ بدگماں میرا
کہ رات ذکر بہت کچھ رہا وہاں میرا

یہ کیا کہ غیر نے جو کچھ کہا بجا ہے وہی
مری زبان سے سنتے مگر بیاں میرا

جنوں نے جور کا شکوہ کیا تو کہتے ہیں
کہاں کو چھوڑ کے جاؤ گے آستاں میرا

ہے سر شام ہی سے بھاری رات
ہائے کیسے کٹے گی ساری رات

سرسری تھا گلہ جور و جفائے جاں
تم پشیماں نہ کرو مجھ کو پشیماں ہو کر

غم تو یہ ہے کہ میں نے ان سے بات
کیوں کہی دل کی بے قراری کی

ہجر میں کون تھا مرا ہمدرد
کچھ ترے غم نے غمگساری کی

اے جنوں مر کے اس ستمگر پر
قدر بھی کھوئی جاں نثاری کی

جنوں کے صاحبزادے قاضی عبدالجلیل بھی شاعر تھے اور انکا تخلص حیراں تھا، انھوں نے ابتدا میں حسن رضا خاں حسن تلمیذ داغ سے کلام پر اصلاح لی، بعد میں جب اختلاف عقائد کی بنا پر دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے، تو حافظ علی بھیتی کو کلام دکھایا، اس طرح انکے دونوں اساتذہ دبستان غالب سے غیر متعلق تھے، حیراں کا انتقال ۱۹۳۹ء میں ہوا، ان کے انتقال کے بعد اس خاندان کی اعلیٰ ادبی روایات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سید مفتی سید احمد خاں متوفی ۱۸۹۸ء	غالب نے اپنے مکتوب بنام قاضی عبدالجمیل جنوں میں لکھا تھا :- "صاحب وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے مجھکو پہنچا اور اسکا جواب تم کو بھیجا" (عود ہندی ۲۳۲)

اس مکتوب میں سید مظلوم سے مراد مفتی سید احمد خاں سید ہیں، جو جنوں کی اہلیہ کے حقیقی ماموں تھے، مفتی سید احمد خاں کے والد کا نام سید کرامت علی تھا اور وہ سنبھل (ضلع مراد آباد) کے رہنے والے تھے، مفتی صاحب بریلی میں رہتے تھے، وہ ایک خوبصورت اور خوش سیرت، علم و فضل سے آراستہ تھے۔ انھوں نے مروجہ علوم کے ساتھ فن طب

کی تحصیل کی تھی، ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انھوں نے انگریزوں کے خلاف نواب خان بہادر خاں کا ساتھ دیا، خان بہادر خاں کی نظامت کے زمانے میں وہ مفتی کے عہدے پر سرفراز ہوئے، بریلی میں انگریزوں کے تسلط کے بعد بغاوت کے جرم میں جزائر انڈمان بھیجے گئے، خاک وطن نصیب نہ ہوئی، جوان العمری میں فوت ہوئے، کوئی اولاد نہیں تھی کہ سلسلۂ خاندان باقی رہتا۔ (آئینۂ دلدار ص ۱۲۸، سہ ماہی اردو، کراچی جنوری ۱۹۶۷ء ص ۷۰، ۷۱)

مفتی سید احمد خاں، مرزا غالب کے شاگرد تھے، سید تخلص تھا، مرزا صاحب کو ان سے بڑی خصوصیت تھی۔ اپنے فارسی مکتوب تاریخ ۳ اکتوبر ۱۸۵۰ء کو ان سطروں سے شروع کرتے ہیں :

"سید عالی تبار اگرچہ سر گرم دیش گاہش روئے سیاہ خویش بزمیں سائیم۔ و ہر چند از شرم گناہ سخن نمی توانیم کرد ہم بدیں اندیشہ کہ مبادا رفتہ رفتہ پیوند مہر از ہم گسلد ناچار گفتگو آئیم۔ درود نامہ نامی جان در تن و فسون شادمانی بر من دمید۔ الخ" (آئینۂ دلدار ص ۹۱)

جولائی ۱۸۵۰ء میں مرزا صاحب نے تاریخ تیموریہ لکھنا شروع کی تھی جس کی وجہ سے بہت مصروف تھے، اور یہ مصروفیت تعویق جواب کا سبب بنی تھی، چنانچہ فرماتے ہیں :-

"سخن این ست کہ خسرو انجم سپاہ دہلی خلد اللہ ملکہ و سلطانہ نامہ نگار را بہ نگارش تواریخ فرمانروایان تیموریہ و کشور کشایان بابریہ گماشتہ است و از سہ ماہ بدیں کار ماموریم روز و شب خامہ از جنبش آرام ندارد۔ رسالہا و وقائع و سوانح سلاطین سلف بر یک دگر نہادہ و دفتر دفتر اوراق پراگندہ بر خوانده، سر گذشت ہا را انتخاب زدن و با زبہ عبارتے روشن مسودہ کردن و مسودہ را دگر بارہ دوبار بسواد اندر آوردن یکے نظر گاہ کار فرما فرستادن و یکے خود نگاہ داشتن۔ و این ہمہ کارہا بہ تنہائی انجام دادن۔ من و تم و دل، اگرچہ بار آشوب دارد الخ" (آئینۂ دلدار ص ۹۲)

مرزا صاحب نے مفتی صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ مولوی دلدار علی صاحب مذاق (۱۸۱۹ء تا ۱۸۹۲ء) تلمیذ ذوق سے مشورہ سخن کریں۔

"دل بہ نثر آنچناں بستہ ام کہ بہ نظم تو انم پرداخت مشفقی مولوی محمد دلدار علی صاحب مذاق کہ بدانست بندہ در

سخن آفرینی با سلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوق بر ابرود ۔ باعتقاد خویش شاگرد آں دیرینہ سخنور اند آخر زبہم و ہمنشین آن والا گہر اند چرا بایشان در سخن مشورت نرود ۔ مشورت در سخن ننگ نیست ۔ غلط کاراں استادی و شاگردی را دو ریدہ اند ۔ نزد بندہ ہمزبانے و ہم نفسے بیش نیست ۔ نامہ نگار شاگرداں خویش را ہمدم و ہمراز می شمرد و ہر گز بچشم کم درانان نمی نگرد ۔ اوستاد چرا با خود بالد و شاگرد چرا فروتنی کند کہ در ہر راہ در گام از خود پیش است رہنما بود نقش بجائے خویش است۔" الخ

(آئینہ دلدار۔ ص ۹۲ و ۹۳)

اس مکتوب کے علاوہ مفتی صاحب کے نام ان کا کوئی اور مکتوب نہیں ملتا، مفتی صاحب کا کلام بھی نہیں ملتا، البتہ ایک مناجات جو انھوں نے انڈمان میں لکھی تھی، محمد ابرار علی صدیقی مؤلف "آئینہ دلدار" کے پاس محفوظ ہے، محمد ایوب قادری نے اس مناجات کے تین بند حکیم عبدالغفور آنولوی بریلوی کی قلمی بیاض (۱۸۸۱ء) سے حاصل کرکے اپنے مقالے "جزائر انڈمان و نکوبار میں مسلمانوں کی علمی خدمات" میں نقل کیے ہیں، بطور نمونہ کلام وہ تین بند یہاں نقل کر رہا ہوں۔

قسم ہے تجھے اے نسیم سحر ۔۔۔ مری بیکسی پر ذرا رحم کر
میسر نہیں کوئی پیغامبر ۔۔۔ مدینے میں ہو کے جو تیرا گذر
تو میری طرف سے زمیں چوم کر ۔۔۔ یہ کہنا بدرگاہِ خیر البشر

نبی الوریٰ یا نبی الوریٰ
ببیں حالِ ما یا نبی الوریٰ

بندھے بند آہن سے دست و پا ۔۔۔ رہا ہند یک چند آب و غذا
نہ سننا تھا جو کچھ وہ سب کچھ سنا ۔۔۔ نہ ہونا تھا جو کچھ وہ سب کچھ ہوا
لٹا گھر دیار و وطن بھی چھٹا ۔۔۔ چھٹے سب کے سب دوست و آشنا

نبی الوریٰ یا نبی الوریٰ
ببیں حالِ ما یا نبی الوریٰ

جہاں پر عیاں حسن اخلاق ہے ۔۔۔ ثنا گر ترا آپ خلاق ہے
ترے نام سے روشن آفاق ہے ۔۔۔ تری ذات احسان میں طاق ہے
اسیری بہت اس پہ اب شاق ہے ۔۔۔ یہ سید رہائی کا مشتاق ہے

نبی الوریٰ یا نبی الوریٰ
ببیں حالِ ما یا نبی الوریٰ ۔۔۔ (ششماہی اردو کراچی جنوری ۱۹۶۸ء)

حب، محمد حسین، متوفی ۱۸۹۰ء

ان کے متعلق مالک رام نے تذکرہ ضیغم کے حوالے سے تلامذۂ غالب میں تحریر کیا ہے:

"یہ نو مسلم تھے، ان کے والد کا نام بہادر سنگھ تھا، فارسی اور ریاضی میں بھی اچھی مہارت تھی، اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے۔ ۱۳۰۷ھ [۱۸۸۹ء۔ ۱۸۹۰ء] میں انتقال ہوا۔"[1]

بوسہ مژگاں و ابرو کا چکھاتا ہے مزہ ۔۔۔ لب سے زخم دل کا مل جانا تری تلوار کا
قیس سے جو دشت بالکل تھا تم نے لے لیا ۔۔۔ بستیوں پر چل کے اب دعویٰ کرو کہسار کا
اسیر پنجہ خورشید ماہ را دیدم ۔۔۔ گرفت دست نگاریں چو جام مینا را

مجھے ان کے متعلق مزید معلومات نہیں مل سکیں،

وحشی، قاضی عبدالرحمن

وحشی کے متعلق مجھ سے بریلی کے ایک معمر سخنور، علی حسین ضمیر (متوفی ۲۶ جون ۱۹۶۸ء) نے کہا تھا کہ ان کا تعلق خاندان مفتیان سے تھا اور وہ محلہ ذخیرہ میں رہتے تھے، میں نے ضمیر صاحب مرحوم کی نشاندہی پر مفتی صابر حسن شیوا عثمانی سے دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا

"ایک ہی خاندان کے چند نفوس بریلی آکر مقیم ہوگئے، ایک گھر فراش ٹولے میں میرے حقیقی منجھلے پھوپھا صاحب قبلہ مولوی سید اکبر حسن صاحب غفور لہٗ کا، دوسرا گھر میری دادھیال گلی مفتیان، تیسرا گھر میرے والد صاحب قبلہ کی ننھیال مولوی سید عنایت علی صاحب جو ذخیرہ میں تھی اور پرانے زمانے میں حویلی میر عنایت علی صاحب کے نام سے مشہور تھی، چوتھا گھر میرے نانا صاحب قبلہ کا جس میں بھائی صاحب قبلہ [مفتی صادق حسن صادق] فروکش ہیں، پھاٹک مولوی برکات احمد صاحب وکیل کے نام سے

[1] تلامذۂ غالب ص ۱۹۳

ابتک مشہور ہے، اس کے پہلے بڑی حویلی، دوسری حویلی میر حسن کے نام سے معروف تھی، اور پانچواں گھر چھوٹی حویلی ہو گو حویلی میر محسن صاحب جو قاضی عبدالرحمٰن وحشی کے بزرگوں کی تھی اور چھٹا گھر مولوی قاضی صاحب قاضی عبدالجمیل صاحب جنون کا تھا" الخ

"عجب اتفاق ہے کہ اسوقت میری ہمشیرہ صاحبہ آئی ہوئی ہیں، ان قاضی صاحب [قاضی عبدالرحمٰن وحشی] کے متعلق ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ بڑے پھوپھا جان (مولوی مفتی حکیم عزیز الحسن صاحب قبلہ مرحوم) کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے اور وہ ہمیشہ انکے پاس رہے، ان ہی کے پاس ان کا انتقال بھی ہوا" (مکتوب گرامی جناب شیوا صاحب بنام راقم مورخہ ۳ اپریل ۹۷ء)

میر محسن صاحب کے متعلق تو کچھ معلوم نہ ہو سکا بجز اسکے کہ وہ بھی خاندان مفتیان بریلی کے ایک بزرگ تھے اور کسی زمانے میں ایک حویلی انکے نام سے منسوب تھی، البتہ مفتی عزیز الحسن صاحب سے متعلق معلوم ہوا کہ وہ مفتی محمد حسن خاں اسیر، صدر الصدور مراد آباد (جنکے یہاں غالب نے رامپور سے واپسی پر پانچ روز قیام کیا تھا) کے فرزند اور نامور طبیب تھے، قاضی عبدالرحمٰن وحشی انکے خالہ زاد بھائی تھے۔

قاضی عبدالرحمٰن وحشی کی ایک غزل گلدستہ نہال سخن بریلی بابتہ جون ۱۹۱۲ء میں چھپی تھی جس پر قاضی صاحب کے نام کے ساتھ تلمیذ غالب بھی تحریر ہے، وہ غزل یہ ہے:-

جاں فروشی کا اگر دعوی عدو کرتے ہیں
لیجئے ہم بھی تہ تیغ گلو کرتے ہیں

چاٹ یہ حضرت واعظ کو پڑی ہو مے کی
ہم اگر جام تو خالی وہ سبو کرتے ہیں

آپ جو جا ہیں کہیں آپ کی بیجا بھی بجا
غیر کیوں آپ کی باتوں پہ رفو کرتے ہیں

تشنۂ شوق شہادت ہیں بلا کے جانباز
آپ شمشیر سے تر اپنا گلو کرتے ہیں

زخم سوزن میں ہے کچھ کچھ اثر نوک مژہ
لب زخم اسلیے ارمان رفو کرتے ہیں

ہاتھ آیا مجھے اس پردہ نشیں کا دامن
جس کو لینے کو فرشتے بھی وضو کرتے ہیں

نگہ جلوہ پرست ان کی نہ دل، اے عشق
کیوں مرا رشک بھرا یے دوست عدو کرتے ہیں

کیوں نہ ہو پشت فلک خم شدہ ناز زمیں
بود و باش اس پہ جو بر آئینہ رو کرتے ہیں۔

کہیں وحشی کی نمازیں بھی قضا ہوتی ہیں
میکدہ میں وہ گلابی سے وضو کرتے ہیں

قاضی عبدالرحمٰن وحشی کا مزید کلام دستیاب نہیں ہوا۔

تہذیب کی تشکیل جدید

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۶)

متکلمین میں فخر الدین رازی کی تعبیر

متکلمین نے جو تعبیرات اختیار کی ہیں اُن کا خلاصہ یہ ہے:-

امام فخر الدین رازی کہتے ہیں:-

"اللہ کا رسول کاملین میں سب سے زیادہ کامل اور فاضلین میں سب سے زیادہ فاضل ہوتا ہے، وہ انسانیت کی آخری حد پر ہوتا ہے، پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر نوع کی انتہا دوسری بلند نوع کی ابتدا سے ہوتی ہے، نوع بشر کی انتہا جو کہ ملکوتیت کی ابتدا ہے اس بنا پر اللہ کا رسول ان اوصاف سے متصف ہوتا ہے جو ملکوتیت کے مناسب ہوتے ہیں، مثلاً جسمانی علائق کی طرف اسکی توجہ کم ہوتی ہے اور عالم رُوحانیت میں جذب و انجذاب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسکی بنا پر اسکی قوت نظری اسقدر کامل ہوتی ہے کہ اس میں تجلیات قدسیہ اور معارف الٰہیہ مرتسم ہوتے ہیں، اور قوت عملی اسقدر موثر ہوتی ہے کہ عالم اجسام میں اسکے ہاتھوں تصرفات وجود میں آتے ہیں، معجزہ سے یہی مراد ہے۔[1]

امام غزالی کی تعبیر

امام غزالی خواص نبوت میں کہتے ہیں:-

وبها خواص ثلث احدها تابعة لقوة التخيل والثانية تابعة لقوة العقل النظري والثالثة لقوة العقل العملي[2]

نبوت کے تین خاصے ہیں، ایک خاصہ قوت تخیل کے تابع ہے، دوسرا قوت عقل نظری کے تابع ہے اور تیسرا قوۃ عقل عملی کے تابع ہے۔

پھر قوت تخیل کی کارگذاری بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"قوۃ متخیلہ بیداری کے عالم میں وہی عمل کرتی ہے جو خواب کی حالت میں کرتی ہے یعنی ان واقعات کو لیتی ہے

---

[1] مطالب عالیہ المقدمۃ الخامسہ [2] معارج القدس مخطوطہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

انکی حکایت کرتی (نقل اتارتی) ہے، اور قوت حسیہ پر یہاں تک چھا جاتی ہے کہ متخیلہ کی صورتیں حس مشترک میں اتر آتی ہیں، پھر اسکے بعد طرح طرح کی خدائی (غیبی) صورتیں دکھائی دیتی اور خدائی باتیں سنائی دیتی ہیں جو مدرکات وحی کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ حالت ضعف نبوت کے کمتر درجہ کی ہے، اس سے قوی تر درجہ یہ ہے کہ حالتیں اور صورتیں اس مضبوطی کے ساتھ اپنی ہیئت پر قائم ہو جائیں کہ وہ قوۃ متخیلہ کو دوسری چیزوں کی تصویر اتارنے کا موقع ہی نہ دیں، پھر اس سے بھی زیادہ قوی درجہ یہ ہے کہ قوۃ متخیلہ حکایت کرنے اور نقل کرنے میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے اور قوۃ عقلیہ اور وہم اسکی قائم کردہ صورتوں سے اختلاف نہ کریں تو متخیلہ کی قائم کردہ صورتیں حافظہ میں رہ جائیں گی اور قوت متخیلہ حس مشترک پر اس حد تک اثر انداز ہوگی کہ اس میں عجیب غریب صورتیں منقش ہونگی، اور ہر ایک اپنا کام اپنے طریقہ پر جاری رکھے گی، یہ نبوت کا وہ طبقہ (درجہ) ہے جس کا تعلق قوت عقلی اور خیالی سے ہے۔" (معارج القدس)

ایک اور جگہ کہتے ہیں:-

ان لسان الحال يصير شاهداً محسوساً على سبيل التمثيل وهذه خاصية الانبياء والرسل عليهم الصلوة والتسليم كما ان لسان الحال يتمثل في المنام لغير الانبياء ويسمعون صوتاً وكلاماً ممن يرى في منامه ان جماداً يكلمه او فرساً يخاطبه او ميتاً يعطيه شيئاً او يأخذ بيده او يسلب منه شيئاً .... وغير ذلك مما يراه النائم في منامه فالانبياء عليهم الصلوة والسلام يرون ذلك في اليقظة ويخاطبهم هذه الاشياء في اليقظة فان المتيقظ لا يميز بين ان يكون ذلك نطقاً خيالياً او نطقاً حسياً من خارج والنائم [illegible] (... الركن الثاني)	یہ نبیوں اور رسولوں کا خاصہ ہے کہ انکے سامنے زبان حال متمثل ہو کر مشاہد و محسوس ہوتی ہے جس طرح نیند کی حالت میں زبان حال غیر انبیاء کے سامنے متمثل ہو کر محسوس ہوتی ہے اور وہ آواز و گفتگو سنتے ہیں مثلاً سونے والا اونٹ و گھوڑے کو کلام کرتا ہوا دیکھتا ہے، نیز میت کو کوئی چیز دیتے یا پکڑتے یا چھینتے ہوئے دیکھتا ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام ان چیزوں کو بیداری کی حالت میں دیکھتے ہیں، اور ان سے یہ چیزیں گفتگو کرتی ہیں، فرق اس قدر ہے کہ بیدار شخص تمیز نہیں کر پاتا کہ یہ گفتگو خیالی ہے یا حسی و خارجی ہے، اور سونے والا شخص بیداری کے بعد جان لیتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی تعبیر

شاہ ولی اللہ صاحب کہتے ہیں:- "اللہ کے ارادہ کے مطابق رسول ایسی تجلیات سے مستفید ہوتا ہے جو اس کو بشریت سے اچک کر حظیرۃ القدس میں پہنچا دیتی ہے جس کے بعد ملاء اعلیٰ کے علوم انکی باہمی گفتگو، رحمت الٰہی کے ارادے اور الہام خیر جو لوگوں کے دلوں میں ہیں یہ سب وحی متلو کی شکل میں رسول کے مدارک میں منعقد ہوتے ہیں اور پھر کتاب کی شکل میں منظم ہوتے ہیں۔" (فیوض الحرمین ص ۱۶ و ۱۷ مطبع احمدی)

دوسری جگہ ہے:-

وكذلك الوحي المتلو لا ينعقد الا في الالفاظ والكلمات والاساليب المخزونة في ذهن الموحى اليه وكذلك اوحى الله الى العرب باللغة العربية والى السريانيين باللغة السريانية (ایضاً)	اسی طرح وحی متلو صرف ان الفاظ، کلموں اور اسلوب میں منعقد ہوتی ہے جو رسول کے ذہنی خزانہ میں محفوظ ہوتے ہیں، اور اسی طرح اللہ نے عربوں کیلئے عربی زبان اور سریانی بولنے والوں کے لیے سریانی زبان میں وحی کی۔

شاہ صاحب نے فارسی رسالہ سطعات میں بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے، اس میں کہتے ہیں۔

"تدبیر الٰہی جو اصلح کے انتخاب پر مبنی ہے وہ ایک زمانہ میں اسکی مقتضی ہوتی ہے کہ انسانوں میں ایک فرد کامل کو واسطہ بنا کر اسکے ہاتھوں اپنے مقصود کو پورا کرے، چنانچہ یہ ارادہ بعینہ اس فرد کامل کے حجر بحت (دل کا اعلیٰ حصہ) میں اس طرح منطبع ہو جاتا ہے جیسے سورج کی ہیئت آئینہ میں منطبع ہوتی ہے، اسوقت قلبی و عقلی قوتیں حجر بحت کے نور سے منور ہو جاتی ہیں، اور بہت سے علوم و بیشمار ارادے اس پر نازل ہوتے ہیں۔" (سطعات ص [illegible])

مذکورہ تصریحات میں نفس ناطقہ، قوۃ متخیلہ، قلب، حجر بحت (دل کا اعلیٰ حصہ) وغیرہ کو اصل اہمیت حاصل ہے جن کی وضاحت قوائے باطنی، خلقی وجدان، داخلی شعور اور باطنی فعالیت یا عقل و قلب کی ترقی یافتہ شکل سے کی جاسکتی ہے۔

متقدمین نے وحی اور مقام نبوت کو ماوراء عقل تسلیم کیا ہے

ان تعبیرات کے باوجود متقدمین نے وحی اور مقام نبوت کو ماوراء عقل تسلیم کیا ہے۔

جیسا کہ ابن خلدون نے کہا ہے :۔

واتبع ما امرك الشارع من اعتقادك وعملك فهو احرص على سعادتك واعلم بما ينفعك لانه من طور فوق ادراكك ومن نطاق اوسع من نطاق عقلك وليس ذلك بقادح في العقل ومداركه بل العقل ميزان صحيح فاحكامه يقينية لا كذب فيها غير انك لا تطمع ان تزن به امور التوحيد والآخرة وحقيقة النبوة وحقائق الصفات الالٰهية وكل ماوراء طوره فان ذلك طمع في محال

(مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر ص ۳۰۲)

شارع کے بتائے ہوئے اعتقادات اور اعمال کا اتباع کرو کیونکہ وہ تم سے زیادہ تمہارے بہی خواہ اور تمہارے فائدہ کی چیزوں کو جاننے والے ہیں۔ کیونکہ ان کا علم تمہارے ادراک سے بالا اور ایسے ذریعہ سے حاصل ہے جو دائرہ عقل کے دائرہ سے وسیع تر ہے، یہ چیز عقل اور اسکے ادراک کے منافی نہیں ہے بلکہ عقل ہی میزان صحیح ہے اسکے احکام (بڑی حد تک) یقینی اور جھوٹ سے پاک ہوتے ہیں لیکن یہ میزان ایسی نہیں ہے جس سے توحید و آخرت کے امور اور نبوت و صفات الٰہیہ کے حقائق کا وزن کر سکیں، ایسا کرنا محالی طمع ہے کیونکہ یہ چیزیں عقل کی رسائی اور ادراک سے ماورا ہیں۔

پھر عقل کی محدودیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

ومثال ذلك مثال رجل رأى الميزان الذي يوزن به الذهب فطمع ان يزن به الجبال وهذا لا يدرك على ان الميزان في احكامه غير صادق لكن العقل قد يقف عنده ولا يتعدى طوره حتى يكون له ان يحيط بالله وبصفاته فانه ذرة من ذرات الوجود الحاصل منه وتفطن في هذا اغلاط من

اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سونا چاندی تولنے کا ترازو سے پہاڑ تولنے کا ارادہ کرے (اور جب ایسا کرنے میں ناکام رہے تو) یہ نہ کہا جائیگا کہ کانٹا (ترازو) وزن بتانے میں ناقص ہے بلکہ یہ کہا جائیگا کہ ترازو کی ایک حد ہے جس کے آگے وہ کام نہیں دے سکتی ہے، اسی طرح میزان عقل کی بھی ایک حد ہے جہاں وہ ٹھہر جاتی ہے، اس سے آگے اللہ کی ذات و صفات کا احاطہ نہیں کر سکتی ہے کیونکہ عقل بھی وجود کے ان ذرات میں سے ایک ذرہ ہے جو اللہ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے، اس

يقدم العقل على السمع في امثال هذه القضايا وقصور فهمه واضمحلال رأيه

(مقدمہ ابن خلدون ص ۳۰۴ مطبوعہ مصر)

سے تم ان لوگوں کی غلطی اور کم فہمی معلوم کر سکتے ہو جو عقل کو اس قسم کے معاملات میں نقلی (سمعیات) پر ترجیح دیتے ہیں

امام غزالی نے کہا ہے

عقل سے ماوراء ایک راستہ ہے جس میں دوسری (باطنی) آنکھ کھلتی ہے، اور اس کے ذریعہ غیب کی باتیں اور مستقبل کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں اور ان امور کا انکشاف ہوتا ہے جن میں عقل کام نہیں دے سکتی ..... جن بعض عقلاء نے اس بات کا انکار کیا ہے انکے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، ان کا یہ انکار محض جہالت کی وجہ سے ہے۔ (المنقذ من الضلال القول في خواص النبوة)

شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) نے کہا ہے :

چنانچہ طور عقل وراء طور حس است کہ آنچہ بحس مدرک نشود عقل ادراک آں می نماید ہمچنیں طور نبوت وراء طور عقل است آنچہ بعقل مدرک نشود بتوسل نبوت درک می آید وہر کہ وراء طور عقل طریقے از برائے معرفت اثبات نمی نماید فی الحقیقت منکر نبوة است ومتصادم بداہت

(المکتوبات مجدد جلد ۳)

جس طرح عقل کا راستہ حواس کے راستہ سے ماوراء ہے کہ جو چیز حواس کے ذریعہ نہ جانی جا سکے اس کو عقل معلوم کر لیتی ہے، اسی طرح نبوت کا راستہ عقل کے راستے سے ماوراء ہے، جو بات عقل سے نہ معلوم ہو سکے وہ نبوت کے ذریعہ سے معلوم ہو جاتی ہے جو شخص عقل کے ماوراء کوئی ذریعہ علم نہیں تسلیم کرتا وہ در اصل نبوت کا منکر اور بداہت سے متصادم ہے۔

وحی اور مقام نبوت کو ماورائے عقل تسلیم کرنے کے باوجود مذکورہ تعبیرات میں دو قسم کی خامیاں ہیں: (۱) شعور ولایت اور شعور نبوت کا فرق واضح نہیں ہے (۲) قرآن و حدیث میں امتیاز قائم کرنا حد درجہ مشکل ہے۔ لیکن تشکیل جدید میں جو تعبیر اختیار کی گئی ہے اس میں دونوں کے مقامات اور سرچشمے علحدہ علحدہ اور ایک دوسرے سے متمائز ہیں، اس بنا پر جدید تعبیر میں مذکورہ خامیوں کی گنجائش نہیں ہے، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ شعور ولایت کا تعلق مقام قلب سے ہے اور شعور نبوت کا مقام وحی سے ہے

(حاشیہ: مذکورہ تعبیرات میں دو قسم کی خامیاں ہیں)

(حاشیہ: تشکیل جدید کی تعبیر میں یہ خامیاں نہیں ہیں)

پھر ان دونوں کے اعتبار سے وحی کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) ایک وہ جسکا سرچشمہ مقام قلب ہے ۔ (۲) وہ جس کا سرچشمہ مقام وحی ہے ۔

پہلی قسم کلام نبی (حدیث) ہے جو نبوت کے خلقی وجدان و داخلی شعور کا نتیجہ ہے ، اور دوسری قسم کلام الٰہی (قرآن) جو ارتقاء انسانیت کی آخری منزل پر آخری پیغمبر کو اللہ کی طرف سے عطا ہوا ہے ،

کلام عرب میں لفظ وحی کا استعمال چونکہ عام ہے مثلاً اشارہ کرنا ، لکھنا ، پیغام بھیجنا ، خفیہ بات کرنا اور دل میں بات ڈالنا وغیرہ[1] ، اس بنا پر شرعی اعتبار سے دونوں قسموں پر اس کا اطلاق صحیح ہے ،

ایک شبہہ کا جواب اس تعبیر میں حدیث کا سرچشمہ اگرچہ مقام قلب ہے لیکن اس سے اسکی اہمیت اور استناد و اعتبار میں کوئی فرق نہیں آتا ، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے قلوب ہر وقت نور نبوت اور تجلیاتی شعور سے متصف رہتے ہیں ، اور نفس و شیطان کی خلل اندازیوں سے انکی حفاظت ہوتی رہتی ہے ، چنانچہ ابن تیمیہ کہتے ہیں :-

فمن جرب مايقولونه (اى الانبياء) ويقوله غيرهم وجد الصواب معهم والخطاء مخالفهم كما قال الرازي مع انه من اعظم الناس طعنا فى الادلة السمعية[2] لقد تاملت الطرق الكلامية والمناهج الفلسفية فما رأيتها تشفي عليلا و تروي غليلا و وجدت اقرب الطرق طريقة القرآن اقرأ فى الاثبات اليه يصعد الكلم الطيب الخ والرحمن على العرش استوى واقرأ فى النفي ليس كمثله شئ ، ولا يحيطون به علما ومن جرب مثل تجربتى عرف مثل معرفتى وايضا فمن اعتبر ما عند الطوائف الذين لايتبعون بتليغ الانبياء وارشادهم واخبارهم وجدهم كلهم حائرين ضالين شاكين مرتابين او جاهلين جهلا مركبا

(رسائل ابن تیمیہ ، رسالہ الفرقان مطبوعہ مصر ص ۱۰۹)

جس شخص نے بھی انبیاء علیہم السلام کے ارشادات اور دوسروں کے اقوال کا تجربہ کیا ہے اس نے یقیناً انبیاء کو حق پر اور انکے مخالفوں کو خطا پر پایا ہے جیسا کہ امام رازی کو جو سمعی دلائل پر طعن کرنے میں سب سے آگے ہیں یہ کہنا پڑا کہ میں نے فلسفہ اور علم کلام کے طریقوں میں بہت غور کیا مگر ان میں سے کسی کو مریض کو شفا دینے والا اور پیاسے کو سیراب کرنے والا نہیں پایا ، البتہ قرآن کا طریقہ سب سے زیادہ قریب پایا ، مثلاً اثبات میں یہ آیات الیہ یصعد الکلم الطیب الخ اور الرحمن علی العرش استوی اور نفی میں یہ آیتیں لیس کمثلہ شئ اور لا یحیطون بہ علما جو شخص میری طرح تجربہ کریگا اس پر میری ہی طرح یہ منکشف ہو جائے گا اور جو شخص ان لوگوں کے اقوال میں غور کرے گا جنھوں نے انبیاء کی تعلیم اور ان کے ارشادات کو مضبوطی کے ساتھ نہیں پکڑا تو وہ ان کو تحیر ، شک ، گمراہی اور جہل مرکب میں مبتلا پائے گا ۔

[1] لسان العرب حرف الواو و دالیا ، قاموس المحیط باب لواو دالبا ، اقرب الموارد باب لواو ، المفردات الواو مع الحا ،

[2] رسائل ابن تیمیہ رسالہ الفرقان ۔

وحی کو عقل و قلب دونوں پر فوقیت حاصل ہے تشکیل جدید میں وحی کو عقل و قلب دونوں پر فوقیت حاصل ہے ، لیکن وحی ہر امر واقعی کو بالالتزام نہیں بیان کرتی ، بلکہ عقل و قلب کو بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کا موقع دیتی ہے ، ایسی حالت میں اگر ان میں سے صرف ایک کو رہنمائی کے لیے کافی سمجھ لیا گیا تو نہ ماورائی ذہنیت کی نمود ہوگی اور نہ انسان اپنا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے گا ۔ جیسا کہ عارفین نے کہا ہے

الشرع لم يلتزم بيان كل امر واقعى ما نفاه فهو منفى فى نفس الامر وما اثبته فهو ثابت فيها وما سكت عنه فيحتملهما فالدال على احدهما لا يعارض الشرع فتنبه ولا تكن من الغافلين

(عبقات عبقہ ۴)

شریعت نے ہر امر واقعی کے بیان کا التزام نہیں کیا ہے ، جس چیز کی نفی کی وہ حقیقت میں منفی ہے اور جس کا اثبات کیا ہے وہ حقیقت میں ثابت ہے اور جس سے خاموشی اختیار کی اس میں دونوں احتمال ہیں ، پس جو احتمال دور کر کے ایک سمت متعین کردیگا وہ شریعت کے معارض نہ ہوگا ، خبردار ہو جاؤ اور غافل مت بنو ۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تینوں ذرائع علم عقل، قلب اور وحی میں اصلاً کوئی تعارض نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھ رکھا ہے۔

دراصل تعارض کی شکل داخلی وخارجی (طبعی حجابات وضعی حالات) دباؤ سے پیدا ہوتی اور ان لوگوں میں رونما ہوتی ہے جو اس دباؤ کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتے ہیں، لیکن جو لوگ اس دباؤ کے اثر سے محفوظ رہتے ہیں ان کے ذرائع علم میں تعارض کی کبھی کوئی شکل نہیں پیدا ہوتی ہے۔

وکل من الطرق الثلث اذا کان سالماً عما یخل فی افادته العلم فلا یمکن التعاند بینها والا لزم اجتماع المتعاندات فی نفس الامر[1]

اگر تینوں راستے ان چیزوں سے محفوظ ہوں جو افادۂ علم میں مخل ہوتی ہیں تو ان میں تعارض کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، ورنہ پھر امر واقعی میں متعارضات کا اجتماع لازم آئیگا جو محال ہے۔

داخلی وخارجی دباؤ سے حفاظت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ظاہری وباطنی قوی کے لحاظ سے کمال اعتدال پر فائز ہوتے ہیں اور تشکیل جدید میں یہ مقام صرف انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص ہے۔

لکن هذه الناحیة مختصة بالنبی المعصوم الذی یعصمه من المهد الی اللحد[2]

لیکن حفاظت کی ہر سمت انبیاء کے ساتھ خاص ہے جن کی عہد سے لے کر لحد تک حفاظت ہوتی ہے۔

---

[1] صفحات عبقہ ۲ [2] الفقیہ فی المصطلح الشرعیہ البحث الاسلامی فروری ۱۹۶۸ء

مطبوعات جدیدہ

نفس مناظرہ المعروف بہ مباحث سنی شیعہ، جلد اول ودوم مرتبہ علامہ سید نہال احمد صاحب نقوی مرحوم تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات جلد اول ۴۳۱، جلد دوم ۳۶۸، مجلد ہر دو حصہ مع گرد پوش قیمت بالترتیب ۲۰ و ۱۸ روپیہ، پتہ: ۱۹۲۹ حویلی میر افضل لال کنواں، دہلی ۶۔

اب اس زمانہ میں شیعہ سنی کی پرانی اختلافی بحثیں بڑی حد تک متروک ہو چکی ہیں، پیش نظر کتاب میں دونوں فرقوں کے بعض بنیادی نزاعی مسائل اور اہم اختلافات پر بحث کی گئی ہے، پہلی جلد میں خلافت وامامت اور حدیث قرطاس، اور دوسری میں فدک ومتعہ پر بحث ہے، مصنف مرحوم گو سنی ہیں، لیکن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ اور سشن جج بھی رہ چکے ہیں، اس لیے انھوں نے غیر متعلق بحثوں میں پڑے بغیر علمی ومنطقی انداز میں دونوں فرقوں کا نقطۂ نظر پیش کرکے ان میں محاکمہ کیا ہے، اور خود شیعہ علماء کی کتابوں سے ان کا نقطۂ نظر غلط ثابت کیا ہے، پیرایۂ بیان سنجیدہ ومتین ہے لیکن کہیں کہیں تلخی آگئی ہے، اور بعض صحیح روایات کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اس کتاب میں عام مناظرانہ رنگ نہیں آنے پایا ہے، اسلیے دونوں فرقوں کے لیے قابل مطالعہ ہے۔

فکر گستاخ ۔ از جناب سید ذوالحسین صاحب نقوی تقطیع خورد، کتابت، طباعت، کاغذ بہتر، صفحات ۲۰۲ مجلد مع گرد پوش قیمت ۱۲ روپیہ: دانش محل بک سیلرز، امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ۔

مصنف ایک معمر پختہ مشق صاحب قلم ہیں، یہ کتاب ان کے دس ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں انھوں نے بعض ادبی مسائل ادب وزندگی، ادب وسائنس اور فنون لطیفہ پر اظہار خیال بھی کیا ہے، اور بعض مشہور شعراء اور ادیبوں، میر، غالب، اقبال اور مہدی افادی وغیرہ کا ناقدانہ مطالعہ بھی کیا ہے، جگر

اور مجاز وغیرہ پر انکے مضامین تاثراتی ہیں، جمہری افادی کے انھوں نے عیوب تو گنائے ہیں لیکن انکے محاسن کو نظرانداز کردیا ہے، اس سے قطع نظر ادب میں ترقی پسندی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بہت متوازن اور اکثر مضامین غور و فکر سے لکھے گئے ہیں، اور ادبی حیثیت سے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔

جمہوری سوشلزم و سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ۔ ترجمہ جناب جلیس عابدی و گوپال متل صاحبان

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۲۲۸ و ۱۲۵، قیمت ہر دو کتاب عیر پتہ:

نیشنل اکاڈمی ۹/ انصاری مارکیٹ دریا گنج۔ دہلی ۶/

یہ دونوں کتابیں نیشنل اکاڈمی نے شائع کی ہیں، پہلی کتاب میں موجودہ دور کے مشہور و مقبول نظام جمہوری سوشلزم کا جائزہ لیا گیا اور اسکے حقیقی خد و خال دکھائے گئے ہیں اور جمہوری سوشلزم کی تعریف، اس کے اصولوں، زندگی و سماج کے مختلف شعبوں کے متعلق اسکے تصورات، خدمات، رفاہی اداروں اور ترقیاتی اسکیموں کا ذکر اور بین الاقوامی اور ترقی پذیر دنیا سے اسکے تعلقات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اور جن ملکوں میں یہ نظام رائج ہے ان سے مثالیں دی گئی ہیں اور اسی کے ساتھ ان کی بعض خامیاں بھی دکھلائی گئی ہیں۔

دوسری کتاب میں آجکل کے مروج اکتالیس اہم سیاسی اصطلاحات مثلاً آزادی، امن، نو آبادیات، جمہوریت سوشلزم اور فاشزم وغیرہ کی حقیقت اور صحیح نوعیت واضح کی گئی ہے، یہ دونوں معلومات افزا کتابیں انگریزی میں تھیں، اردو خواں طبقہ کے لیے لائق مترجمین نے ان کا سلیس و شگفتہ ترجمہ شائع کردیا ہے۔

سائنسدانوں کو دعوت حق۔ مرتبہ جناب اسد اللہ خاں علیگ، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر

صفحات ۲۰، قیمت ۵۰ پیسے۔ پتہ بارگاہ ادب اکبر روڈ کراچی ۱/

سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود اسکے نظریات برابر تبدیل اور غلط ثابت ہوتے رہتے ہیں، قرآن مجید اگرچہ اصلاً سائنس کی کتاب نہیں ہے لیکن وہ سائنسی مسائل سے بالکل خالی بھی نہیں ہے، اور اسکے بیان کردہ حقائق میں اب تک کوئی رد و بدل نہیں ہو سکا ہے، اس لئے مصنف نے چند عنوانات کے تحت اس قسم کی کچھ آیتوں کے ترجمے اس کتابچہ میں جمع کرکے سائنسدانوں کو اسکے حقائق پر ازخود غور و فکر کی دعوت دی ہے، ترجمہ مولانا شیخ محمد صاحب کے ترجمۂ قرآن سے ماخوذ ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۳ ماہ ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۹ء عدد ۳

مضامین

مقالات